

گنبد کا طوفان

اشتیاق احمد

925

شمار 925  
معماری کتب ہر قسم کے رسائل اور ڈائجسٹوں کی  
مخبرہ و فروخت کنندہ مرکز - ٹوٹ ٹوٹ لائبریری  
کالج روڈ سمن آباد لاہور - فون : 273999

کتاب کے  
میں سے صورت میں  
لیا جائیگا

نصاب  
محمود، قدروق، فرخزادہ اور انسپکٹر جمشید میر

گیند کا طوفان  
اشتیاق احمد

# چکشیف



حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی  
کو کافر کہا ، تو دونوں میں سے ایک کافر ہو گیا —  
جس کو کافر کہا ، اگر وہ کافر نہیں تو کہنے والا  
کافر ہو گیا —



حضرت عقیق بن یحییٰ سے روایت ہے کہ

کینڈ کا طوفان —————  
اشتیاق احمد —————  
حسین نامدار —————  
سردق —————  
مطیع —————  
طاعت سردق —————  
قیمت ————— ۶/۵۰ روپے  
سالانہ قیمت ————— ۳۵۰/۰۰ روپے

اشتیاق پبلی کیشنز  
۹/۱۲ نصیر آباد ، مسلم پورہ  
ساندھ سٹالوں ، لاہور



## دوباتیں

السلام علیکم! آپ عید گزادیکے۔ خاص نمبر پڑھ چکے۔ مجھے عید کارڈوں کے تبادلے اور سالہ کرچے۔ دوسرے لفظوں میں آپ ملنے ملود پر غار غریب کے اور تو اور سکونوں کے طریقے سے بھی رادوی عیش عیش لکھتا ہے۔ لیکن میرا حال اس کے بالکل الٹ ہے۔ خاص نمبر کے ڈالے، عید کارڈوں کا ڈھیر، خاص نمبر کا انعام سوال۔ چار ٹاؤن وغیرہ۔ اب کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔ خیر بات تو یہ کہ تو کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ عید کارڈوں پر بات ہو جائے۔ میں اب تمام قارئین کا حد درجے شکریہ گزار ہوں۔ جنہوں نے عید کارڈوں کے ذریعے اور خطوط کے ذریعے عید کے مبارکباد دیے۔ آئندہ سالہ کے لیے میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ اسے اچھے گھر میں باندھ لیں، ہو سکتا ہے، آئندہ

عید سے پہلے آنے والے ٹاؤنوں میں وہ تجویز لکھنا جوں جوں۔ اب لگے ہاتھوں باغ یاد ہے۔ توڑ کر لیں۔ آئندہ سالہ آپ سے کوئی بھی مجھے عید کارڈ نہ بھیجے۔ عید مبارک کے مرض ایک خط کے ذریعے دے دیں اور اس طرح جو پیے آپے بچائیں۔ وہ کبھی غریب کو دے دیں۔ میرے خیال میں یہ ایک عمدہ طریقہ ہوگا۔ کیا خیال ہے آپ

شعبان

یہ کتاب اچھی حالت میں ہے کتاب کے  
پہلے اپنی حساب ہونے کی صورت میں  
میں یہ بابت ماند کاٹ لیا جائے گا  
سیکوریٹی

پروفیسر دادو فاروق کے ہاتھ میں وہ ننھی سی گیند دیکھ  
حیرت زدہ رہ گئے :

یہ - یہ کیا ہے جی - وہ بولے۔

جی نائیکون کی گیند - فاروق نے ان کی طرف حیرت بھری  
دیکھی۔

یہ - ذرا دکھانا مجھے - ان کی آواز میں کپکپی تھی - اب تو  
جیتوں ہی پریشان ہو گئے۔

فاروق نے کھوئے کھوئے انداز میں گیند ان کی طرف  
دیکھی - وہ چند لمحے تک اس کو اپنی انگلیوں میں گھماتے

تھے - پھر یک دم کھڑے ہو گئے - دوسرے ہی لمحے  
ان کے منہ سے نکل چکے تھے - دروازہ آواز کے ساتھ بند

یہ تم کیا مصیبت ساتھ لے آئے - محمود نے فاروق کو

ناول پڑھنے سے پہلے دیکھ لیں کہ :

- یہ وقت نماز کا تو نہیں۔
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
- کل آپ کو کوئی شٹ باسٹان تو نہیں۔
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا۔
- آپ کے ذمے گھر والے نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- اگر ایسا باتوہ میرے لئے ایسا باتوہ میرے لئے۔
- تو ناول اللہ کے لئے رکھ دیجئے۔ پتے ملا دیجئے۔
- کاموں سے فارغ ہو لیجئے۔ پھر ناول پڑھیں۔

اشتیاق احمد



تو اب ان کے واپس آنے پر ہی معلوم ہوگا؟  
 پروفیسر داؤد کی واپسی گیارہ منٹ بعد ہوئی۔ ان کے  
 چہرے پر شدید الجھن کے آثار تھے:  
 جمشید اس وقت کہاں ہے؟ وہ بولے۔

جی۔ گھر میں ہیں۔  
 ہوں! ٹھیک ہے۔ یہ کدھر انھوں نے فون کا ریسپور  
 اٹھایا، نمبر گھمائے اور بولے:  
 ہیلو جمشید۔ تمہاری یہاں فوری ضرورت ہے۔ یہ کدھر  
 انھوں نے ریسپور رکھ دیا۔

آپ بہت پریشان ہیں انکل۔ خیر تو ہے۔  
 نظر نہیں آتی۔ وہ بولے۔  
 کیا چیز؟ فاروق بولا۔  
 خیر۔ انھوں نے کہا۔

اللہ اپنا رحم فرمائے۔ تینوں ایک ساتھ بولے۔  
 پھر انپیکٹر جمشید وہاں پہنچ گئے۔ وہ بھی فکر مند لگ  
 رہے تھے:

آپ نے اس انداز سے مجھے بہت ہی خاص موقعوں  
 پر لایا ہے پروفیسر صاحب۔ آتے ہی انھوں نے کہا۔  
 یہ موقع بھی کم خاص نہیں ہے۔ اس گیند کو خود سے

اگر میں جانتا کہ یہ گیند مصیبت بننے والی ہے تو ہرگز  
 اسے ہاتھ نہ لگاتا۔

یہ گیند تمہیں ملی کہاں سے؟  
 کونسا روم سے۔ میں کلاس سے صبح سے آخر میں  
 لے رہا تھا۔ یہ گیند مجھے ایک بیچ کے پائے کے ساتھ بڑی نظر  
 آئی۔ میں نے سوچا۔ کسی کلاس فیلو کی گر گئی ہے، صبح  
 اسے دس دوں گا، ایس میں اسے اٹھا لایا۔ میں نے اسے  
 جیب میں ڈال لیا تھا۔ دیکھنے میں کافی خوب صورت لگتی  
 ہے۔ پھر ہمارا یہاں آنے کا پروگرام بن گیا۔ جب تو  
 گھنٹی بج رہے تھے۔ اس وقت میرا ہاتھ جیب میں چلا  
 گیا۔ اور یہ گیند ہاتھ میں آ گئی۔ بے خیالی میں میں نے  
 اسے جیب سے نکال لیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔  
 لیکن یہ اتنی سی بات اب بڑی بات بننے لگی والی  
 ہے۔ فرزانہ مسکرائی۔

اگر ہماری قسمت میں یہی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں  
 فاروق نے کندھے اچکائے۔

”بظاہر اس گیند میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔  
 نہ جانے پروفیسر انکل کو کیا نظر آگیا۔ محمود بڑبڑایا۔

جیو جمشید - انھوں نے گیند میز پر ٹکراتے ہوئے کہا، لیکن وہ  
 روکتے تھے۔ انپکٹر جمشید نے گیند کو پکڑ لیا اور اسے گھما  
 دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ خوب صحت گیند ہے۔ انھوں  
 نے کہا۔

لیکن میں نے تمہیں یہاں اس کی خوب صوفی پر بات  
 کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ انھوں نے منہ بنایا۔  
 "تو پھر؟"

"میں جانتا چاہتا ہوں۔ یہ گیند فاروق کے پاس کس  
 طرح پہنچی؟"

"یہ بات تو اٹکل۔ آپ ان کی مدد کے بغیر بھی ہم  
 سے پوچھ سکتے تھے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ جاننے کے بعد بھی جمشید کی ضرورت پڑتی۔ اس  
 لیے میں نے سوچا، پہلے ہی بلا لوں۔ وہ بولے۔  
 "چلو فاروق بتاؤ۔"

فاروق نے وہی تفصیل دہرا دی۔ جو محمود اور فرزانہ کو  
 بتائی تھی۔

"اوہ۔ تب تو معاملہ آسان ہو گیا۔" پروفیسر داؤد خوش  
 ہو کر بولے۔

جی کیا مطلب؟

صبح تم یہ گیند لے کر سکول جاؤ گے۔ اور کلاس روم  
 میں سب لڑکوں کو گیند دکھا کر پوچھو گے کہ یہ کس کی  
 ہے۔

اور پھر میں یہ گیند اسے لوٹا دوں؟ فاروق نے پوچھا۔  
 ہرگز نہیں۔ گیند اس کو نہیں۔ مجھے دو گے۔ جمشید  
 تم اس لڑکے کا پتا معلوم کر کے، اس کے اور اس کے  
 گھرانے کے بارے میں بہت احتیاط سے چھان بین کرو گے۔  
 آخر بات کیا ہے؟ انپکٹر جمشید بولے۔

بات ابھی نہیں بتا سکتا۔ پروفیسر داؤد نے کہا۔  
 جی کیا مطلب۔ بات ابھی نہیں بتا سکتے۔ محمود نے گھبرا  
 کر کہا۔

ہاں! ابھی نہیں۔ ابھی انتظار کرنا ہو گا۔  
 اور یہ انتظار کافی لمبا ہو گا۔ کیوں کہ سکول تو اب کل  
 سے گا۔ محمود بڑبڑایا۔

لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے تو سکول  
 سے۔ پروفیسر داؤد نے کندھے اُچکاتے۔

سب شدید بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب  
 میرا، خان رحمان اور کئی دوسروں کا بھی اکثر تم لوگ یہ



من کرتے ہو۔ آج مجھے موقع ملا ہے تو میں بھی خوب  
بے چین کروں گا۔ پہلے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ گیند کس کی  
ہے۔ انھوں نے قدرے مسکرا کر کہا۔

جی بہتر اُوہ بولے۔

دوسری صبح فاروق نے بیچر کے آنے سے پہلے گیند سب  
بڑوں کو دکھاتے ہوئے کہا:

”یہ گیند مجھے کل کلاس میں ملی ہے۔ جس کی ہو، بتا  
سکتا ہے۔“

”اوہ۔ یہ۔ یہ۔ یہ میری ہے۔“ ایک لڑکے نے اٹھ کر بے تابانہ  
انداز میں کہا۔

محمود اور فاروق نے دیکھا۔ وہ دیکھان انصاری تھا۔ فلک  
انصاری کا بیٹا۔ اور فلک انصاری کے بارے میں وہ کچھ  
نہیں جانتے تھے۔

اس وقت تک ریحان گیند لینے کے لیے آگے بڑھ چکا تھا۔  
”گیند ہے بہت خوب صورت۔ ریحان آپ نے یہ کہاں سے  
خریدی تھی؟“ محمود نے سرسری انداز میں کہا۔

”خ۔ خریدی۔ نہیں تو۔ میں نے یہ خریدی تو کہیں  
بھی نہیں۔“ اس نے فوراً کہا۔

”ارے تو پھر؟“ فاروق اور محمود ایک ساتھ بولے۔

”مگر کے ایک کونے میں پڑی نظر آئی تھی۔ میں نے اٹھا  
لیا اور اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ پھر شاید یہ مجھ سے یہاں  
گرتی۔ اس نے کہا۔“

”اوہ۔ تب تو بھئی۔ آپ ذرا انگ چل کر ہماری ایک  
بات سن لیں۔“

”اوہ۔ آئیے۔ اب اس نے بھی حیران ہو کر کہا۔

وہ اسے کلاس روم سے باہر لے آئے۔ اسی وقت ان  
کے بیچر کلاس کی طرف آرہے تھے۔

”آپ کہاں چل دیے بھئی۔ چلیے اندر۔“ انھوں نے کہا۔

”ہم تینوں کو معاف فرمائیں۔ ایک اہم معاملہ درپیش  
ہے۔ ہم شاید یہ پیریڈ نہیں لے سکیں گے۔“ محمود نے با ادب  
کہا۔

بیچر محمود اور فاروق کو اچھی طرح جانتے تھے۔ فوراً بولے۔

”خروج۔ خروج۔ کیوں نہیں۔“ اور آگے بڑھ گئے۔

”ہم معاملہ درپیش ہے۔“ ریحان کے منہ سے نکلا۔  
”اور یہ۔ آئیے۔“

”محمود نے اپنی موٹر سائیکل  
سکول سے باہر لے آئے۔“

”پھر فرزانہ کے سکول کی طرف چل دیے۔“

”محمود نے بٹھایا اور چاروں دفتر پہنچے۔ انیکٹر جمشید



نے ان کی طرف دیکھتے ہی کہا:

”تو گیند ان کی ہے۔“

جہ نہیں۔ ان کی بھی نہیں۔ البتہ انھیں اپنے گھر کے

ایک کونے میں بڑی ملی تھی۔“

ریحان کے چہرے پر اب ایک رنگ آ رہا تھا تو دُور

جا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا:

”آنسو ات کیا ہے۔“

بریشاں ہونے کی ضرورت نہیں۔ آئیے۔ ہم ذرا آپ

کے گھر چلیں گے۔ آپ کے ابو اس وقت کہاں مل سکیں

گے؟

”گھر ہی ملیں گے۔“ اس نے کہا۔

”کیوں! وہ کیا کام کرتے ہیں؟“

”ہماری زمینیں ہیں۔“ وہ بولا۔

”تب تو ٹھیک ہے۔“

اب وہ جیب میں بیٹھے اور فلک انصاری کے گھر پہنچے

ایک شان دار کوٹھی تھی۔ ریحان نے جیب سے آٹھ روپے

گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی ایک ملازم نے دروازہ کھولا اور

چونک کر بولا:

”چھوٹے صاحب آپ۔ خیر تو ہے۔ آپ سکول سے

پہنچے۔“

”ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ آبا جان کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”میں انھیں لے کر آتا ہوں۔“

”نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ یہ انھیں اطلاع

دیا جائے گا۔ آپ ہمیں ڈرائنگ روم تک لے چلیں۔“ انپکٹر جمشید

نے خود کہا۔

”اوہ! اچھا۔ جاؤ قاسم۔ ابو کو بلا لاؤ۔“

”بہت بہتر جناب۔“ ملازم بولا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا

۔۔۔

ریحان انھیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ڈرائنگ روم

بڑے سے سجا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک لمبے چوڑے

تھوڑے قامت کا آدمی اندر داخل ہوا، اس کے منہ میں سگار

۔۔۔

خیر تو ہے ریحان۔ یہ حضرات کون ہیں؟ اس کے لہجے

پر غور کرو اور فاروق ہیں ابو، میرے کلاس فیلو۔ اور یہ

انپکٹر جمشید ہیں۔ یہ فرزند ہیں۔ ان کی بیٹی۔“

وہ چونکا، پھر گرم جوشی سے آگے بڑھا اور

ان سے ہاتھ ملائے۔ فرزانہ کے سر پر ہاتھ پیرتے ہوئے اس نے کہا:

لیکن بات کیا ہے۔ اس وقت تو آپ لوگوں کو سکول میں ہونا چاہیے تھا۔

”یہ سکول سے ہی آرہے ہیں۔ معاملہ ہے، اس گیند کا انپیکٹر جھینڈ نے یہ کہا اور گیند اس کے سامنے رکھ دی۔ گیند کو دیکھ کر فلک انصاری کی آنکھوں میں آنکھیں تیر گئی۔

چند سیکنڈ تک اس کو گھورنے کے بعد وہ بولا:

”ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس گیند کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔“

یہ گیند ریحان صاحب کو گھر کے کسی کونے میں بڑی ملی تھی۔ انھوں نے اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔

”اوہ۔ اوہ۔“ ان کے منہ سے نکلا۔

”ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ آپ کے گھر میں کیوں تھی۔“

”پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ یہ ہے کیا بلا۔ اور آپ لوگ اس کے لیے کیوں پریشان ہیں۔“ اس نے کہا۔

اب فاروق کو تفصیل سنانا پڑی، پھر انپیکٹر جھینڈ بولے:

”پروفیسر داؤد صاحب کو اس گیند میں کوئی خاص بات

نہیں ہے۔ وہ خاص بات کیا ہے، یہ ابھی انھوں نے ہمیں بتایا، وہ فوری طور پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ بات سے آئی ہے۔“

تب تو معاملہ الجھ گیا۔ کیوں کہ یہ بات تو میں بھی سمجھتا تھا۔

آپ نے ابھی فرمایا ہے۔ گیند کو کہیں دیکھ چکے ہیں۔

اے! میرا ذہن یہی کڑ رہا ہے۔ شاید میں نے بھی اس کو اپنے گھر میں کہیں پڑا دیکھا ہو گا، لیکن بچوں کے کہنے کی چیز سمجھ کر توجہ نہیں دی ہو گی۔

اس سے تو پھر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گیند کے بارے میں تو آپ کو کچھ معلوم ہے اور نہ ریحان صاحب کو۔

تب یہ کہ گھر کے دوسرے افراد سے پوچھ گچھ کرنا پڑے۔

یہاں اور کتنے افراد رہتے ہیں؟

ریحان کی والدہ۔ اس کی بہن اور دو ملازم ہیں۔ قاسم

نشان میاں۔

ریحان کی والدہ سے فرزانہ معلوم کرے گی۔ باقی لوگوں کو یہاں جمع کر سکتے ہیں۔ لہذا پہلے سب کو یہاں

لیجئے۔ لیکن ان کو گیند کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔

جیسے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کروں گا۔



بعض اوقات آدمی جھوٹ بولتا ہے، لیکن اس کا چہرہ اس جھوٹ کی جعلی کھاتا ہے۔

اچھی بات ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ گھر کے کسی فرد کو اس گیند کے بارے میں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت ہو گی۔

اس کا امکان ہے۔ پروفیسر داؤد بلاویر تو اس گیند کے لیے پریشان نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے کہا۔

”خیر! میں ان تینوں کو جہاں بلا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے دروازے کے پاس لگا ایک مین دیا دیا۔ فوراً قاسم اندر داخل ہوا۔ شاید وہ دروازے کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔

”جی فرمائیے۔“

”جی فرمائیے کی کیا ضرورت ہے۔ تم سن تو چکے ہو۔“ انپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

”اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔ پھر فلک انصاری نے سخت لہجے میں کہا:

”یہ کیا حرکت تھی۔“

”کوئی بات نہیں جناب۔ اس کو ڈانٹنے کی ضرورت نہیں۔ تم یہیں ٹھہرو جی۔ آپ گھنٹی پھر بجائیے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

گھنٹی بجائی۔ آدھ منٹ بعد دوسرا ملازم فرحان اس کے داخل ہوا۔ اس نے سوالیہ انداز میں سب کو دیکھا:

”کیا ہو رہا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

”جی ہاں۔“

ابھی دیکھا ہے۔

ٹیک ہے۔ آپ سب لوگ جاسکتے ہیں، لیکن مسٹر قاسم ہمارے ساتھ جائیں گے۔ پولیس اسٹیشن۔ انپکٹر جمشید نے درامائی انداز میں کہا۔

”کک۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ان کے چہرے سے جھوٹ صاف ظاہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گیند کے بارے میں ضرور کچھ جانتے ہیں۔“

”قاسم یہ کیا بات ہے؟“

”م۔ میں۔ میں کیا کہوں۔“

”کیا تم اس گیند کو پہلے کہیں دیکھ چکے ہو؟“

”جی نہیں۔ یہ غلط ہے۔ اگر میں اس کو کہیں اور دیکھتا تو یہ بات بتانے میں بھلا کیا حرج تھا۔ اس نے

چکا ہوتا تو یہ بات بتانے میں بھلا کیا حرج تھا۔ اس نے بنا کر کہا۔

”کوئی حرج ہوگا۔ تبھی تو تم نہیں بتا رہے ہو۔“

جمشید نے چستے ہوئے انداز میں کہا۔

”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں۔“

اس نے جتنا کر کہا۔

”آپ اپنے ملازم کے بات کرنے کا انداز دیکھ رہے

صاحب۔ انپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

”قاسم۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”جی جناب۔ مجھ پر بلاوجہ الزام لگایا جا رہا ہے۔ اس سے کہہ کر ان میں کہا۔

”یہ میرا ریکارڈ ہے۔ بلاوجہ کسی پر الزام نہیں لگاتا۔ میں

جس جگہ یہ بات ثابت کروں گا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ انپکٹر جمشید بولے۔

”اوہ! فلک انصاری کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

”جی جناب۔ ثابت کیے بغیر میں اس کو یہاں سے نہیں

دھکیں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ محمود اکرام کو فون کرو۔

”میں کر رہا ہوں۔ صرف شہر کا تین سال کا ریکارڈ۔“

”بہتر! محمود نے کہا اور فون کرنے لگا۔

اب انھوں نے قاسم کا رنگ اڑتے دیکھا۔ یہ بات

انصاری نے بھی محسوس کی۔

”تم۔ تم سچ سچ کیوں نہیں کہہ دیتے۔“

”اس گیند کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے

سے پہلی غلط بات تو یہ کہ ہمدانی آمد کے بعد

دروازے سے چپک کر اندر ہونے والی گفتگو



تھے رہے ، دوسری غلط بات یہ کہ گیند کو دیکھ کر چونکے۔ تیری غلط بات یہ کہ تم اب تک تین مرتبہ پستول جیب سے نکالنے کی کوشش کر چکے ہو۔ لیکن میری نظروں کی وجہ سے ابھی تک یہ کام نہیں کر سکے۔ لیکن اگر تم پستول نکال بھی لیتے ، تب بھی کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ تم اس پستول کو چلا نہیں سکتے تھے۔ انپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

”یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ پستول۔“ فلک انصاری نے بوکھلا کر کہا۔ ریحان اور راضیہ تو دھک سے رہ گئے۔

”ہاں ! اس کی جیب میں ایک نیٹا سا پستول بھی موجود ہے۔ جو اس نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے رکھا ہوا ہے۔ اس گیند کو لانے والا یہی ہے۔ یا پھر گیند اس کے ذریعے گھر میں داخل کی گئی۔ لیکن کیوں۔ یہ ہم اس سے پوچھیں گے۔“ انھوں نے کہا۔

”ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ گیند ہے کیا بلا۔“ فلک انصاری نے کہا۔

”یہ بات ہمیں بھی نہیں معلوم۔ لیکن بیرونیسر داؤد چاہتے تھے کہ پہلے ہم یہ معلوم کریں۔ یہ گیند آئی کہاں سے۔“

”یہ تو خیر ہم ابھی تک معلوم نہیں کر سکے۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

اکرام کے آنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد یہ اپنے ہونٹوں سے تیس رکھ سکے گا۔“ انھوں نے کہا۔

”سلاحدہ درجے پُر اسرار ہو گیا ہے۔“ راضیہ کے منہ سے نکلا۔

”ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔“ فاروق نے کہا۔

”اسی وقت محمود نے ریسور رکھ دیا اور بولا :

”نکل اکرام آ رہے ہیں۔“

”فاروق تم آگے بڑھ کر اس کی جیب سے پستول نکال کر جمشید نے کہا۔

”خبردار۔ جو کسی نے میرے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔“

”ابو۔ یہ انداز۔ اب تو مجھے آگے بڑھنا ہوگا ، کیوں کہ میں گھر کے افراد بھی ہیں۔“ انھوں نے کہا اور یک دم پھر چھلانگ لگا دی۔ قاسم نے اس چھلانگ کی زد سے

”لیکن۔ وہ بچ نہیں سکا۔“ انپکٹر جمشید نے اسے

”جیسے کوئی باز کسی چڑیا کو۔ اور پھر انھوں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ دوسرے ہی لمحے گردن پر ان کا ہاتھ لگا اور وہ گرتا چلا گیا۔“

یہ - یہ کیا ہوا؟ فلک انصاری نے کانپ کر کہا۔

صفت بے ہوش ہوا ہے۔ فکر نہ کریں۔

میں اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی، لیکن یہ انداز اکرام

کا نہیں تھا۔

## یہ رہا سر

یہ آپ کا کوئی ملاقاتی ہے؟ انیکٹر جمید بولے۔

اوہ اچھا - فرقان میاں - تم دیکھو۔ فلک انصاری نے کہا۔

جی اچھا! ملازم بولا اور کمرے سے نکل گیا۔ جلد ہی

فرقان کو ایسے اندر داخل ہوا، اس کی آنکھوں پر جدید

سینک تھی۔ اس کے شیشوں میں سے اس کی آنکھیں

دیکھ رہی تھیں۔

انہیں آپ سے ملنا ہے۔ فرقان میاں نے فلک انصار

کو دیکھا۔

جی فرمائیے۔

یہ - یہ - اس کمرے میں کیا ہو رہا ہے جناب۔

فرقان پریشان ہو کر بولا۔

میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا ہے۔ آئیے میں

آپ کو دوسرے کمرے میں لے چلوں۔ آپ اپنی بات



وہاں چلی کر کریں۔

محمود ضرور۔ لیکن۔ یہ۔ ان صاحب کو کیا ہوا۔

میں ذرا بے ہوش ہو گیا ہے۔ فاروق بولا۔

اور۔ حیرت ہے۔ کمال ہے۔ اب لوگ ذرا بے ہوش ہو رہے گئے۔

محمود اور فرزانہ سگڑا دیے۔ فاروق اسے گھور کر رہ گیا۔

فلک انصاری اسے لے کر دروازے کی طرف بڑھا،

اچانک وہ لڑکھڑایا۔ اور مڑ کے بل گرا۔ دراصل وہ قاسم

کی ٹانگوں میں الجھ گیا تھا۔

”سنبھل کر جناب۔ سنبھل کر“ فلک انصاری گھبرا گیا۔

”کک۔ کوئی بات نہیں۔ میری نظر قدم سے کمزور ہے۔“

اس نے کہا اور پھر فلک انصاری کے ساتھ باہر نکل گیا۔

”محمود۔ یہ کچھ عجیب سا شخص جان پڑا ہے۔ تم ان کے

پیچھے جاؤ۔“ انیسٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی انہوں

نے قاسم کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم میں اب حرکت پیدا

ہو چلی تھی۔

محمود فوراً کمرے سے نکل گیا۔ اچانک انیسٹر جمشید

کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ انہوں نے کپکپاتی

آواز میں کہا :

”ن۔ نہیں۔ نہیں۔ فاروق۔ فرزانہ۔ دوڑو۔ وہ جانے پائے۔“

آن کی آن میں فاروق اور فرزانہ سمجھ گئے کہ ان کے والد کس کے بارے میں کڑے ہیں۔ انہوں نے باہر کی طرف چھلانگیں لگا دیں۔ اور پھر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

دروازے پر فلک انصاری بے ہوش پڑا تھا، اس

سے اور محمود کا کہیں پتا نہیں تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا

تھا۔ وہ ان دونوں سے پورے زور میں ٹکرا گیا :

”خیر تو ہے بھئی۔ تہ۔ تم لوگ آنکھیں گھر تو

بھول آئے۔“

لیکن فاروق اور فرزانہ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں کچھ چلے گئے۔“

”نہیں! میں۔“ انہیں کیا ہوا۔ اکرام بڑبڑایا اور پھر اندر

چلے گئے۔

یہ کیا۔ اس نے فلک انصاری کو بے ہوش

دیکھ کر کہا۔ پھر وہ اندر کی طرف بڑھا۔ ایک کمرے

سے اسے مل چل نظر آئی۔ اس کے قدم اس طرف اٹھ گئے،

یہاں بھی ایک شخص کمرے کے فرش پر بڑھا تھا :  
"معلوم ہوتا ہے۔ میدان یہاں بہت گرم ہو چکا ہے۔" اکرام  
کے منہ سے نکلا۔

"اگر اکرام۔ اس شخص کو دیکھو۔ جھلا کیا محسوس ہو رہا ہے۔"  
انپکٹر جشید کی نظریں قاسم پر جمی تھیں۔

اکرام نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ پھر چند سیکنڈ بعد بولا :  
"یہ شخص بے ہوش ہے۔ اور بس۔"

"اچھا خیر۔ یہ بتائیے۔ تم نے اس کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟"

"مم۔ میں نے۔ اوہ۔ آپ کا مطلب ہے۔ یہ کوئی پرانا  
جرائم پیشہ ہے۔"

"میرا خیال یہی ہے۔ اور خیال اس بنا پر ہے

کہ اس نے میری موجودگی میں تین بار پستول

جیب سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بھی میری جیب  
میں پستول کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے

یہ اس انداز سے پستول نکالنا چاہتا تھا کہ میں اسے نکالتے  
ہوئے نہ دیکھ سکوں۔ لیکن میں نے اسے یہ مہلت نہیں دی۔

اس سے پہلے بھی اس کے انداز ماہرانہ تھے۔ لہذا تم ذرا  
اس کے چہرے کا اپنے ریکارڈ سے موازنہ کر لو۔"

"جی بہتر۔ اور یہ فاروق اور فرزانہ کہاں دوڑ گئے ہیں۔"

حمود صاحب کہاں ہیں؟

"ابھی ابھی ایک شخص یہاں آیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے  
گئے ہیں۔ کیا مٹر فلک انصاری نہیں ملے تمہیں؟ انہوں نے  
کہا۔"

"ایک صاحب دروازے پر بے ہوش پڑے ہوئے تو  
ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ وہ کونسی کے مالک فلک انصاری  
ہیں یا کوئی اور۔" اکرام نے کہا۔

"اوہ۔ تب تو۔ تب تو۔" یہ کمرہ وہ باہر کی طرف  
چھپے۔ راضیہ اوہ ریحان بھی گھبرا کر باہر کی طرف بھاگے،

پھر فلک انصاری کو اندر لایا گیا۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔  
"یہ۔ یہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" اکرام کے لہجے میں حیرت

تھی۔

"یہ ساری مہربانی ایک ننھی سی گیند کی ہے۔ یا پھر  
پرونیمر داؤد کی۔"

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"فی الحال ہمیں انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنا  
ہے۔ تم ڈاکٹر کو فون کر دو۔ کہیں انہیں طبی امداد کی ضرورت

نہ ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ ان دونوں کو۔" اکرام نے کہا۔



”دونوں کو یا ایک کو۔ تم فون کر دو۔“ انھوں نے کہا۔

اکرام فون کرنے لگا اور ان کی نظریں پھر قاسم پر جم گئیں۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنے جسم میں خوف کی لہر دوڑتی محسوس کی۔

اکرام فون کر کے فارغ ہوا تو ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا:

”ہاں! اب بتائیے۔ یہ سب کیا ہے۔ آپ کسی گیند اور پروفیسر صاحب کا ذکر کر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب تو یہاں دور دور تک نظر نہیں آ رہے۔“

”ارے ہاں! پروفیسر صاحب کو بھی فون کر کے یہیں بلا دو، اب ان کی یہاں ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ انیکٹر جمشید نے کہا۔

”جی بہتر۔“ اس نے کہا اور پروفیسر داؤد کو بھی فون کرنے لگا۔ فارغ ہونے پر انیکٹر جمشید نے ساری بات اسے بتا دی۔

”اوہو۔ یہ تو حد درجے حیرت انگیز معاملہ ہو گیا۔“

”ہاں! کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ اب تم اپنا ریکارڈ دیکھو۔“ اکرام ریکارڈ دیکھنے لگا۔ بار بار وہ قاسم کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے کہا:

”یہ رہا سر۔“

انیکٹر جمشید ریکارڈ پر جھک گئے۔ قاسم کی شکل صورت کے آدمی کا ریکارڈ موجود تھا۔ وہ تفصیل پڑھتے چلے گئے۔

”تو یہ شخص ایک سائنس دان کے لیے کام کرتا تھا۔ ڈاکٹر ارمات۔ لیکن پھر یہ اور ڈاکٹر ارمات تجربہ گاہ سے غائب پائے گئے۔ اور ان کی تجربہ گاہ میں ایک شخص کی لاش ملی تھی۔ ان پر قتل کا مقدمہ درج ہے۔“ انیکٹر جمشید بولے۔

”جی ہاں! اور اس کا پہلا نام راون ہے۔ یہ بات ہے۔ دسے تین سال پہلے کی۔“ اکرام نے کہا۔

”اور وہ لاش کس کی تھی؟“  
”یہ بات آج تک معلوم نہ ہو سکی۔ اس کو لاوارث خیال کر کے دفن کر دیا گیا تھا۔“

”اور اب یہ قاسم اس گیند کے بارے میں کچھ جانتا ہے، لیکن۔“

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ محمود اندر داخل ہوا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا:

”کیا رہا جیسی؟“  
”وہ نکل گیا۔ سڑک پر اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی، مجھے وقت پر کوئی ٹیکسی نہ مل سکی۔“ اس نے کہا۔

”یہ بُرا ہوا۔ کیا تم نے موٹر سائیکل کے نمبر نوٹ کیے؟“  
انکسٹر جمشید نے منہ بنایا۔

”جی ہاں! نمبر میں نے دیکھ لیے تھے۔ ای۔ کے ۵۱۵۔“  
”چلو خیر۔ اتنا بھی بہت ہے، لیکن وہ دونوں کہاں  
نکل گئے؟“ انکسٹر جمشید بولے۔

”میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ اسے یہ کیا۔“  
محمود چونک اٹھا۔ اس کی نظریں قاسم پر جم گئی تھیں  
اس کے جسم کی رگیں پوری طرح اجڑ آئی تھیں اور اب  
ان میں کوئی چیز دوڑتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔  
”میں اس چیز کو کافی دیر پہلے محسوس کر چکا ہوں، لیکن  
کم از کم یہ میرے ٹکٹے کا اثر نہیں ہو سکتا۔ یا تو اس نے  
کوئی زہر استعمال کیا ہے۔ یا پھر کوئی اور بات ہے۔“

پھر وہاں ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ انہوں نے پہلے قاسم  
کا معائنہ کیا اور الجھن کے انداز میں بولے۔  
”میں سمجھ نہیں سکا۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میری زندگی  
میں ایسا کوئی کیس نہیں گزرا۔“

”خیر۔ اب آپ فلک انصاری کو دیکھ لیں۔“  
انہوں نے فلک انصاری کا جائزہ لیا۔ ایک انجکشن انہیں  
دیا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر

چونک کر بولا:

”م۔ میں۔ مجھے کیا ہوا تھا۔ اوہ یاد آیا۔ اس نے میرے  
سر پر وار کیا تھا۔“

”جی ہاں۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ سیاہ رنگ  
کی چیز۔ وہ اس نے آپ کے سر پر ماری تھی، پھر مجھے  
آتے دیکھ کر اس نے دوڑ گئی تھی۔“  
”یہ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“

”ہم یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کا  
ملازم قاسم ایک سالہ جرائم پیشہ ہے۔ اس پر اور اس  
کے ساتھی ایک سائنس دان پر قتل کا کیس بنا ہوا ہے،  
یہ لوگ ایک نامعلوم آدمی کو قتل کر کے جھاگ نکلے تھے۔  
مارے جانے والے اس شخص کے بارے میں پولیس کچھ  
بھی معلوم نہیں کر سکی تھی۔“

”اوہ۔ اوہ۔“ فلک انصاری کے منہ سے نکلا۔

مارے حیرت اور خوف کے ان کا بُرا حال تھا۔  
ایسے میں فلک انصاری کی نظریں قاسم پر جا پڑیں۔ وہ  
بڑی طرح چونکا:

”یہ۔ یہ اسے کیا ہو رہا ہے؟“  
کوئی اندازہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی کچھ نہیں بتا



کے ! تاہم یہ ابھی زندہ ہے۔

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔“

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ محمود نے دوڑ لگا دی۔ کیوں کہ انداز پرروفیسر داؤد کا تھا۔ جلد ہی وہ انھیں لیے اندر داخل ہوا :

”کیا بات ہے جمشید۔ خیر تو ہے؟“

”ہم اسی گیند کے سلسلے میں یہاں جمع ہیں۔ معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔“

”اوہو اچھا۔ ذرا میں بھی باتیں۔ ان صاحب کو کیا ہوا؟ پروفیسر داؤد نے کہا۔“

ان کی نظریں قاسم پر جم گئیں۔ پھر انپیکٹر جمشید وہاں پیش آنے والے واقعات سناتے گئے۔ ادھر ان کی

نظریں بدستور قاسم پر جمی رہیں، البتہ کان انپیکٹر جمشید کی باتیں سنتے رہے۔ اور پھر جب انھوں نے ڈاکٹر ارماط کا نام لیا تو وہ زور سے چونکے :

”اوہ جمشید اوہ۔“

”کیا ہوا پروفیسر صاحب“

”جب میں نے اس گیند کو دیکھا تو مجھے بے اختیار ڈاکٹ

ارماط یاد آ گیا تھا۔“

تھی۔ کیا مطلب۔ اس گیند سے ڈاکٹر ارماط کا کیا تعلق؟

وہ ایک بار مجھ سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ اس

وقت میں نے اس کے ہاتھ میں بالکل یہی گیند یا بالکل

جیسی گیند دیکھی تھی۔ پروفیسر داؤد نے جلدی جلدی بتایا۔

تو پھر۔ کیا آپ نے اس گیند کے بارے اس سے نہیں

سنا تھا۔“

بالکل پوچھا تھا۔ لیکن اس نے گول مول جواب دیا

۔ پھر بات پلٹ کر اس نے کہا تھا۔ کہ اس نے

حیرت انگیز چیز دریافت کی ہے۔ چند روز تک مزید

تلاش کرنے کے بعد وہ مشورے کے لیے آنا چاہتا ہے۔

اس نے اس سے کہا تھا کہ ضرور آ جائے گا۔ مجھے کوئی

سہارا نہیں۔ لیکن پھر وہ نہیں آیا۔ میں نے اس کے

کی خبر اخبارات میں پڑھی۔ اور یہ بھی کہ اس کی

گاہ میں ایک شخص ہلاک شدہ ملا تھا۔ اس پر اور

کے ماتحت پر پولیس نے مقدمہ درج کر لیا تھا۔ بس

اس قدر معلوم ہے۔“

لیکن بالکل۔ فاروق کے ہاتھ میں گیند دیکھ کر آپ نہ صرف

بلکہ اس کو لے کر تجربہ گاہ میں بھی گئے تھے۔

کیوں۔ آپ نے اس گیند میں کیا خاص بات دیکھی تھی۔“

محمود نے کہا۔

ہوں۔ فاروق اور فرزانہ جانے کہاں رہ گئے۔ انپکٹر جمشید

”پہلی بات تو یہی کہ یہ گیند میں ڈاکٹر ارمات کے ہاتھ لگی تھی۔“

میں دیکھ چکا تھا۔ دوسری یہ کہ اس نے اس کے بارے میں کیا نہیں دیکھو اباجان؟

میں گول مول جواب دیتا تھا۔ لہذا فاروق کے ہاتھ نہ نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بولے، پھر ڈاکٹر صاحب

دیکھ کر میرا چونک اٹھا۔ قدرتی بات تھی۔ میں نے سوچا۔ اعراف مڑے :

وقت تو میں اس گیند کو چیک نہیں کر سکا تھا۔ آج تو ڈاکٹر صاحب۔ اب پھر قاسم کو دیکھیے۔ اس کی حالت تو

کمر کٹا ہوں۔ لہذا میں نے اس کا معائنہ کیا۔“

”اور کس نتیجے پر پہنچے؟ انپکٹر جمشید بے تابانہ انداز میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا اور

بولے۔ پھر جھک گئے۔ چند منٹ کے معائنے کے بعد بولے :

”میں نے خاص آلات سے اس گیند کو چیک کیا تو میں نے یہی محسوس کیا کہ اسے ہسپتال لے جائیں۔“

ہوا کہ اس گیند میں ان گنت جراثیم موجود ہیں۔ جنہیں اگر آپ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو ضرور لے

کی تھوڑی سی مقدار میں رکھا گیا ہے۔“

”اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔“

”کوئی اور بات؟ انپکٹر جمشید بولے۔“

”مٹنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”ابھی تک تو میں یہی معلوم کر سکا تھا۔ دراصل او کے سر۔“ اس نے کہا اور چلا گیا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر ارمات یاد آ گیا تھا۔ میں نے سوچا۔ فاروق کس کے لیے فون کر رہے تھے۔

گیند کس طرح لگی۔ کیا اس پاس کہیں ڈاکٹر ارمات چھپا اس سے پہلے بھی کبھی ڈاکٹر ارمات آپ سے ملنے کے

ہے۔ بس یہ سوچ کر میں نے فوری طور پر تم کو گولیاں تھکا؟

اس کام پر لگا دیا۔“

مجھے یاد نہیں۔“ پروفیسر داؤد بولے۔



"آپ اس کے بارے میں کوئی خیال بھی ظاہر نہیں کئے۔ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔"

"نہیں۔ چند منٹ کی ملاقات سے بھلا میں کیا اندازہ لگا سکتا تھا۔ بس وہ مجھ سے ملنے آیا۔ اپنا تعارف کرایا پھر اس ایجاد کی بات کر کے چلا گیا۔ انھوں نے کہا۔"

"اب۔ آبا جان اب۔ اس کی رگوں کو دیکھیے۔ محمود کا نپ کر کہا۔"

ان کی نظریں قاسم کی رگوں پر جم گئیں۔ اب اس کی ان کی نظریں قاسم کی رگوں پر جم گئیں۔ اب اس کی

میں کوئی چیز بہت تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ انھوں نے اتنا پُر خوف منظر اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فلک انصاری اور اس کے بچے حیرت سے آنکھیں پکڑ رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں اچانک انپیکٹر جمشید کو ایک خیال سوچھا۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا:

"ڈاکٹر صاحب۔ اس کی جلد کا تو بغور جائزہ لیں۔ کوئی چیز اس کے جسم میں کسی سوئی وغیرہ کے ذریعے داخل نہیں کی گئی۔"

"اوہ اچھا۔ انھوں نے کہا اور اس کے جسم کے ننگے کو دیکھنے لگے۔ اچانک ان کے مز سے نکلا:

"آپ کا خیال ٹھیک نکلا انپیکٹر جمشید۔ یہاں واقعی ایک

سوئی کا نشان موجود ہے۔"

"ہوں۔ تب تو۔ وہ اجنبی شخص دراصل یہی کام کرنے آیا تھا۔"

"جی کیا مطلب؟"

"ہاں! وہ قاسم کو ہلاک کرنے آیا تھا۔ اس نے سوئی کے ذریعے کوئی زہر اس کے جسم میں داخل کیا اور نکل گیا۔"

"حیرت ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے کوئی کسی کو قتل کر گیا۔ محمود بولا۔"

"ابھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا۔ انپیکٹر جمشید نے مزہ بنایا۔"

اسی وقت قاسم نے ایک ہچکی لی۔ اور اس کی رگوں میں حرکت ختم ہو گئی۔

## ہاتھی کے بچے

"یہاں تو نہ اس اجنبی کا پتا ہے نہ محمود کا ہے۔" فرزانہ بڑبڑاتی۔

"یہی ہمارے لیے اچھا ہے کہ کس کو پتا نہ چلتا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" فرزانہ نے اسے گھودا۔

"مطلب یہ کہ اس طرح ہم فوری طور پر واپس جا سکتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"مجھے افسوس ہے فاروق آج تمہاری یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔" فرزانہ مسکراتی۔

"ان خواہشات میں بس یہی بات بُری ہے۔ ویسے تم

نے یہ شان دار اندازہ کس طرح لگایا۔"

"ادھر دیکھو۔ اگرچہ درمیانی فاصلہ کافی ہے۔ لیکن میں محسوس کر سکتی ہوں۔ اس کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی

حس ہم پر جی ہیں۔"

"تو پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔" فاروق نے اس کی طرف سے نظر ڈالی۔

"آخر انہیں کیا ضرورت پڑ گئی گھومنے کی۔"

"چلو۔ چل کر پوچھ لیتے ہیں۔" فرزانہ بھنٹاٹھی۔

"اب پوچھنے کا وقت بھی نکل گیا۔ وہ جا رہے ہیں۔" فاروق جبراً گیا۔

"عد ہو گئی۔ آؤ۔ جلدی کرو۔ ورنہ اباجان خوب نجر گے۔"

اسے کہتے ہیں خ کا فضول استعمال۔

دونوں آگے کی طرف پکے۔ اسی وقت ایک ٹیکسی پاس

گزدی۔ فاروق نے فوراً ہاتھ اٹھا دیا۔ ٹیکسی رُک گئی۔

انہوں نے ایک سیکنڈ ضائع نہیں کیا۔ دوسرے ہی لمحے ان

ٹیکسی بھی اس سمت میں اڑی جا رہی تھی۔ اگلی کار

خ رنگ کی تھی اور ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔

کہاں چلتا ہے صاحب۔" ڈرائیور بولا۔

بس چلتے رہیں۔" فاروق نے گول مول جواب دیا۔

یہ کیا بات ہوئی۔" ڈرائیور نے حیران ہو کر کہا۔

"اس سُرخ کار کو دیکھ رہے ہیں آپ؟"



بالکل دیکھ رہا ہوں۔ کیوں نہ دیکھوں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے دو صحت مند آنکھیں مجھے دے رکھی ہیں۔

”بات تو ٹھیک ہے۔ اچھا تو بس۔ ٹیکسی اس کار کے پیچھے لگاتے رکھیے۔ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور اس قدر نزدیک ہونے کی ضرورت بھی نہیں کہ ان لوگوں کو تعاقب کا شہ ہو جائے۔ فاروق نے جلدی جلدی کہا۔“

”تعاقب۔ ارے۔ تو آپ سرخ کار کا تعاقب کرنا چاہتے ہیں۔“ ڈرائیور نے چمک کر کہا۔

”یہی بات ہے۔“ فرزاں مسکراتی۔

”لیکن میں اس قسم کے کام نہیں کرتا۔“

”ملک اور قوم سے جناب کو کوئی حقدردی ہے۔“

”بالکل ہے۔ ہر ایک کو ہونی چاہیے۔“

”اگر ہم آپ کو بتائیں کہ اس سرخ کار میں جہازم پیشہ لوگ جا رہے ہیں اور ہم ان کا ٹھکانا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کا کیا جواب ہوگا۔“

”اس صورت میں تو تعاقب کرنا پڑے گا۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر۔ صورت حال یہی ہے۔“

”لیکن میں یقین کس طرح کر لوں۔“ وہ بولا۔

”افسوس۔ ہم قسمیں کھانے کے عادی نہیں۔“ فاروق نے

کہا۔

”اچھا خیر۔ میں اعتبار کیے لیتا ہوں، لیکن آپ کو گریہ پورا پورا ادا کرنا ہوگا۔“

”ہاں! کرائے کی آپ فکر نہ کریں۔“ فاروق نے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا، دوسرے ہی لمحے اس کی سٹی لم ہو گئی، ہٹوہ جیب میں نہیں تھا، شاید صبح جیب میں رکھنا یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے گہرا کر فرزاں کی طرف دیکھا۔ اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔ فرزاں اس کا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے بھی اشارے میں کہا:

”میں تو نقدی اپنے پاس رکھتی ہی نہیں۔“

دونوں خاموش بیٹھ گئے اور کمرہ ہی کیا کہتے تھے۔ یہ تعاقب آدھ گھنٹہ تک جاری رہا، پھر کار ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ انھوں نے کار میں سے دو آدمیوں کو اُترتے دیکھا۔

”بس جناب یہیں اتار دیں۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔“

ہم زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ جہاں سے سوار ہوئے تھے، وہیں واپس بھی جانا ہے ہمیں۔ آپ کے وقت کی قیمت ادا کر دی جائے گی۔“ فاروق جلدی جلدی بولا۔

”ضرور جناب۔ کیوں نہیں۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

دونوں ہوٹل کی طرف بڑھے، اس وقت تک وہ دونوں اندر داخل ہو چکے تھے۔ اب ان کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ ہوٹل اوسط درجے کا تھا۔ دروازے پر کوئی دربان بھی نہیں تھا۔ وہ اندر گھستے چلے گئے۔ ہال میں انہیں وہ دونوں کہیں بھی نظر نہ آئے۔

"اب کیا کریں؟" فرزاد بولی۔

"صبر شوکر۔ فاروق نے قہر لیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ آؤ۔" فرزاد نے کہا اور ایک میز کی

طرف بڑھی۔

"کیا ٹھیک ہے؟"

"یہی کہ صبر شوکر کر لیتے ہیں۔"

"تو اس کے لیے ہال کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

فاروق نے منہ بنایا۔

"بھئی ذرا اطمینان سے بیٹھ کر کریں گے۔" فرزاد مسکرائی۔

فاروق بڑے بڑے منہ بناتا اس کے ساتھ قدم

اٹھانے لگا۔ دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔

"سیدھی سی بات ہے۔ ہم ان کے نام نہیں جانتے،

کسی سے ان کے بارے میں کیا پوچھیں۔ اگر وہ ہال میں

نظر آ جاتے تو بات دوسری تھی۔" فرزاد بولی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں وہم ہوا ہو۔ وہ ہماری طرف نہ ٹیک رہے ہوں۔"

"میں ننگا ہوں کے زاویے نوٹ کرنے کی ماہر ہوں۔

تم فکر نہ کرو۔" فرزاد مسکرائی۔

"بہت بہتر۔ مجھے فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے،

فکر کرے گا بے چارہ ٹیکسی ڈرائیور۔ اور ہاں۔ یہاں بھول

کر کسی چیز کا آرڈر نہ دے بیٹھنا۔"

"اچھا۔ نہیں دوں گی۔"

پندرہ منٹ گزر گئے، لیکن ان دونوں کی شکلیں نظر

نہ آئیں۔

"آخر ہم کب تک انتظار کریں۔ کہیں ٹیکسی ڈرائیور اندر

نہ آ جائے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"اوہ ہاں۔ اچھا تو پھر آؤ۔ ہوٹل کے رہائشی حصے کی

طرف چلتے ہیں۔ شاید وہ کسی کمرے میں نظر آ جاتیں۔"

فرزاد بولی۔

"ہاں! وہ ہمارے لیے کمرے کا دروازہ کھلا ہی تو

بھولے بیٹھے ہوں گے۔"

"اور تالوں کے سوراخ کس لیے ہوتے ہیں؟" فرزاد برا

مان گئی۔



دونوں رہائشی حصے میں آئے۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر ایک ایک کمرے کا جائزہ لیتے آگے بڑھنے لگے۔ فرزانہ ایک دروازے کے تالے پر جھکی ہی تھی کہ دروازہ یک دم کھل گیا۔ اور وہ اپنی جھونک میں دروازے کے اندر داخل ہو گئے۔ فوراً ہی انھوں نے مٹا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"یہ اندر داخل ہونے کا کون سا طریقہ ہے؟"

"اور یہ دروازہ کھولنے کا کون سا طریقہ ہے؟" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ بالکل دروازے سے لگے کھڑے ہیں۔ اس نے کہا۔"

اب انھوں نے دیکھا۔ کمرے میں وہی دونوں موجود تھے۔ جن کا تعاقب کرتے وہ یہاں آئے تھے۔ ان کے علاوہ ایک سفید بالوں والا آدمی اور تھا۔ اس سے بال چاندی کے تار معلوم ہو رہے تھے۔ چہرہ بالکل گول تھا، آنکھیں بھی مکمل طور پر گول تھیں۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر نہ جانے انھیں کیوں اُتو یاد آنے لگا۔

"کیا بات ہے۔ تم لوگ کون ہو؟"

"یہی سوال ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں۔" فاروق نے

منہ بنایا۔

"کیا مطلب۔ تم ہوتے کون ہو یہ پوچھنے والے؟"

"ہم ذرا خاص قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"ضرور تمہارا دماغ خراب ہے۔ خیر ہم تم لوگوں کو ہوٹل کی انتظامیہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔"

"لیکن آپ پولیس کو کیوں نہیں بلاتے؟"

"پولیس کا اس معاملے سے کیا تعلق۔ تم لوگ ہوٹل کے مسافروں کو تنگ کر رہے ہو۔ تم جانو۔ ہوٹل کی انتظامیہ جانے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ بلائیے ہوٹل کی انتظامیہ کو۔" فرزانہ

سکرائی۔

"کک۔ کیا مطلب؟"

"آپ ہمیں انتظامیہ کے حوالے کر دیں۔ ہم انھیں بتا دیں گے۔ فرزانہ نے عجیب سے انداز میں کہا۔"

"کیا بتا دیں گے؟"

"جو ہمارا جی چاہے گا۔"

"گوگے۔ فون کرو۔" سفید بالوں والے نے ان میں سے ایک سے کہا جن کا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے تھے۔

گوگے قدرے موٹا تھا اور دُومرا پتلا دبلا۔ لیکن ان کی آنکھوں سے مکاری ٹپک رہی تھی۔ گوگے فون کرنے لگا

اور وہ اطمینان سے کمرے اس کو دیکھتے رہے۔ فون کا دلیلیو  
دکھ کر وہ ان کی طرف مڑا :

”مٹر بانکے آ رہے ہیں۔“

”یہ کون صاحب ہیں؟“

”ہوٹل کے منیجر“ سفید بالوں والا مسکرایا۔

اور پھر قدموں کی آواز آجہری۔ انہوں نے ایک جھادی  
بھر کم آدمی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ انہیں یوں لگا  
جیسے کوئی گینڈا اندر داخل ہو گیا ہو۔

”ہاتھی کے بچے۔ یہ لوگ ہمارے کمرے میں کیوں موج  
ہیں۔ سفید بالوں والے نے آنے والے سے کہا۔

اسے اس گینڈا نما آدمی سے اس لمحے میں بات کرنا  
دیکھ کر غادوق اور فرزانہ حیران ہوئے بغیر رہ سکے۔

”یہ کون ہیں مٹر جواڑی مانا۔“  
”بانکے میاں۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ جواڑی

نے بھٹا کر کہا۔

”بالکل۔ بالکل چل گیا ہوگا جناب۔ آپ کوئی غلط  
بات نہیں کہہ سکتے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔

ہوٹل کے منیجر نے کانپتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ فون  
کی طرف بڑھا۔

”خبردار۔ فون کی طرف قدم بھی نہ اٹھانا بانکے۔“

”تب پھر۔ جناب۔ میں فون کس طرح کر سکوں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے فون کرنے کی۔ ان دونوں کو لے

جاؤ اور کبھی کمرے میں بند کر دو۔ جب تک کہ یہ منہ سے

انگیں نہ کھیں کہ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔“

”ہب۔ بہتر جناب۔ یہ تو اس طرح انگیں گے کہ کیا ان

کے اگلے پچھلوں نے اگلا ہوگا۔“

”اے مٹر۔ صرف ہمارے بارے میں بات کرو۔ ہمارے

خون پچھلوں کی بات کی تو پھر ہم بھی تمہاری سات پشتوں

درمیان میں لے آئیں گے۔“

”اے باپ دے۔ یہ میں نے کیا سنا ہے۔ یہ کل کے

جی اب مجھ پر رعب جمائیں گے، لعنت ہے میرے بانکے

نے پردہ بانکے میاں نے تمللا کر کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب تم اپنے اوپر لعنت ہی بھیج

تھی کے بچے۔ جواڑی مانا بولا۔

”آپ کہتے ہیں تو میں سو بار تیار ہوں۔ لیکن یہ تو

یہ لوگ آخر کون ہیں اور آپ کو ان سے کیا دشمنی

ہے۔“

”کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔ اگر مجھے ان سے

...



دشمنی ہوتی تو یہ اب تک زندہ نظر آتے تھیں۔  
 "ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں  
 ان دونوں کو لے جا کر کسی کمرے میں بند کر دوں۔"  
 "ہاں بالکل۔" جواری ماٹا بولا۔

"چلو میاں۔ سیدھی طرح۔" اس نے ہاتھ نہایا۔  
 "ہمارا جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ جو بات کرنا چاہتے  
 ہیں، یہیں کریں۔" فاروق نے منہ بنایا۔  
 "سنا بانکے۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔"  
 "یہ دراصل آپ کو نہیں جانتے۔ ورنہ ان کا یہ جانا یہاں  
 پسینہ۔" بانکا بولا۔

"جواری ماٹا۔ وہ آدمی ہیں جن سے بڑے بڑے کانپتے ہیں۔"  
 "کانپتے ہوں گے، ہم بڑے بڑے نہیں ہیں۔" فرزانہ بولی۔  
 "دراصل میں آپ کا تعارف صحیح الفاظ میں گرا ہی نہیں  
 سکتا۔" بانکے نے منہ بنایا۔

"خیر۔ جانے دو تعارف کو۔ اگر تم انہیں نہیں لے جا سکتے  
 تو مجھے بتا دو۔ میں گوگے اور سوکھے کو اشارہ کر دیتا ہوں۔"  
 "یہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہو گا۔ اگر میں ان  
 دونوں کو یہاں سے نہ لے جا سکا۔" بانکے نے کہا۔  
 "تو پھر پہلے پانی کا انتظام کر لیں۔"

"فکر نہ کرو۔ اس کمرے میں غسل خانہ ہے۔ اور غسل خانے  
 میں کافی گہرا ٹب بھی موجود ہے۔" جواری ماٹا ہنسا۔  
 "تب ہم حاضر ہیں۔"

بانکا جھومتا جھومتا ان کی طرف بڑھا۔ اس لمحے انہیں لگا  
 جیسے واقعی وہ کوئی ہمتی یا گینڈا ہو۔ پھر ان کے نزدیک  
 آتے ہی اس کے ہاتھ ان کی گردنوں کی طرف بڑھے، لیکن  
 جھلا وہ اپنی گردنیں کب پھسوانے والے تھے۔ ایک جھکائی دے  
 کر اس کی کمر کی طرف پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر ان  
 کی طرف گھومتا۔ دونوں نے سروں کی فکر اس کی کمر پر ایک  
 ساتھ دے ماری۔

وہ لوکڑا گیا۔ تاہم گرا نہیں۔ اتنا ضرور ہوا کہ اس  
 کی آنکھوں میں حیرت دوڑ گئی۔ ادھر جواری ماٹا اور اس کے  
 دونوں ساتھیوں کی آنکھوں میں حد درجے دل چسپی پیدا ہو گئی۔  
 "ہائیں۔" بانکے۔ یہ تو تمہیں نچائے دے رہے ہیں۔  
 جواری ماٹا بولا۔

"شش۔" شاید یہ عام بچے نہیں ہیں۔ میں بے خبری میں  
 مار کھا گیا ہوں۔ اس نے جھینپ کر کہا۔  
 "خیر۔ اب تو تم بے خبر نہیں ہو نا۔"  
 "بالکل نہیں مگر جواری ماٹا۔ اب آپ میرا کمال دیکھئے۔"

” اسی کے لیے تو ترس رہا ہوں۔“ جواری مٹا مٹکایا۔

بانکا ایک بار پھر ان دونوں کی طرف بڑھا۔ دونوں ہر طرح تیار کھڑے تھے۔ بانکے نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ جیسے ان دونوں کو بازوؤں میں جکڑ کر بھینچ ڈالنے کا پروگرام ہو۔ فاروق اور فرزاد کھٹکے کھٹکے دیوار سے جا لگے اور خوف زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا۔ اور جب سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کمرے میں جگہ کم محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک ایک قدم اٹھاتا وہ ان کے عین سروں پر پہنچ گیا اور پھر اس نے ایک جھٹکا مارا۔ فاروق اور فرزاد تیار تھے۔ یک دم نیچے بیٹھ گئے اور پیٹھ کے بعد بھی رکنے نہیں اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر ایک بار پھر اس کی کمر کی طرف آ گئے۔ ادھر اس کے دونوں بازو دیوار سے ٹکرائے تھے۔ وہ تھلا اٹھا۔ لیکن اسی وقت اس پر دوسری قیامت ٹوٹی۔ ایک بار پھر دونوں نے پلیدی طاقت سے اس کی کمر پر ٹکمر دے ماری۔ وہ بازوؤں کی چوٹ کی وجہ سے بلبلا رہا تھا کہ اس ٹکمر نے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی اور پھر وہ گرتا چلا گیا۔

” اس کے ڈوب مرنے کے لیے پانی کا انتظام کر دیں۔“ فرزاد مٹکرائی۔

” واہ۔ کمال ہے۔ ہاتھی کا بچہ جو ہوں سے ماد کھا گیا۔“ دیکھیے جناب! آپ کی زبان شریفانہ ہونی چاہیے۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

” شاید تم نے مجھے بھی بانکا سمجھ لیا ہے۔ گوگے۔ سوکھے۔ ان دونوں کو بتاؤ، میں کیا ہوں۔“

” او کے باس۔“ دونوں ایک ساتھ بولے۔ اب گوگہ اوز سوکھا ان کی طرف بڑھے۔ دونوں نے ایک ساتھ ان پر چھلانگیں لگائیں۔ وہ جھکائی دے گئے۔ اور وہ اپنی ہی جھونک میں بانکے کے اوپر جا گرے۔ ادھر کے نے بھتا کر ہاتھ چلایا، اس کا ہاتھ گوگے کے جڑے پر لگا۔ وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ دونوں ہاتھ جڑے پر گئے۔

” یہ کیا کیا ہے بانکے۔ تم نے گوگے کو بے کار کر دیا۔“ جواری مٹا مٹکایا۔

” اس۔ اس میں میرا کیا قصور۔“ مٹکرائی مٹا۔ ہوں۔ سوکھے۔ دیکھ کیا رہے ہو۔ ان کے انجر پنجر اچیلے کر دو۔“



"اب یہ بے چارہ کیا ڈھیلے کرے گا۔ ان کے تو اپنے ڈھیلے ہو چکے ہیں۔"

"کیوں سوکھے۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔"

"ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے باس۔"

یہ کہتے ہی سوکھا ان پر چیٹ پڑا۔ اس کے دائیں ہاتھ کا ٹمکا فاروق کے منہ کی طرف اور بائیں ہاتھ کا خزانہ کی پسلیوں کی طرف گیا۔ دونوں یک دم بیٹھ گئے۔ اس کے دونوں ہاتھ فضا میں لہرا کر رہ گئے۔ اسی وقت فاروق نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ دھڑک سے گرا۔ خزانہ نے اس کی دوسری ٹانگ پکڑنے میں دیر نہ لگائی۔ اب اس کا سر کمرے کے فرش پر تھا۔ جس کو اس نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اوپر اٹھایا۔

"مٹر جواہری ماٹا۔ آپ کا یہ ساتھی بھی گیا۔ اب کون پروگرام ہے؟"

"خوف ناک۔ جواہری ماٹا بولا۔"

"اس خوف ناک پروگرام کی تفصیل بھی سنا دیں۔"

"ادھر دیکھو۔ اُتوؤ۔ اس نے سرد آواز میں کہا۔"

دونوں نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اب اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کا ایک خوف ناک پستول چمک رہا تھا۔

رہا تھا۔ اور اس کی نال کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔

"یہ کیا؟ فاروق نے منہ بنایا۔"

"اسے پستول کہتے ہیں۔"

"یہ کیا بہادری ہے۔ خزانہ بھٹا کر بولی۔"

"جب ہاتھ پیر ہلائے بغیر ایک کام کیا جاسکتا ہے تو اس کے لیے جسم کو کیوں تھکایا جائے۔"

"تو پھر ان لوگوں کو تھکانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اس وقت مجھے تم لوگوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔"

"تو پھر ذرا آپ بھی بہادری کو آواز دیں اور پستول پینک کر ہم سے دو دو ہاتھ کر لیں۔ فاروق نے گویا دعوت دی۔"

"نہیں! میں احمق نہیں ہوں۔ تم لوگوں کے لڑنے کے انداز سے بھانپ چکا ہوں۔ تمہارے لیے پستول

کی مناسب رہے گا، کیوں کر۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیوں کر کیا؟"

"کیوں کر پستول بازی میں بہت سے لوگ میرا لوہا مانتے ہیں۔ آج تک میرا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا۔"

"اور آج تک آپ نے اپنا نشانہ آزمایا کتنی مرتبہ ہوگا۔"

"ان گنت مرتبہ۔"

"بے جان چیزوں پر؟ فرزانہ نے پوچھا۔"

"اوسے نہیں۔ جان داروں پر۔ وہ بھی جانوروں اور

پتندروں پر نہیں۔ انسانوں پر۔ اس نے فخر کے لہجے میں کہا۔"

"کیا مطلب؟ دونوں زور سے چونکے، کیوں کہ وہ ایک

بہت ہی خوف ناک بات کو دہا تھا۔"

"ہاں! بہت سے لوگوں اور پولیس والوں کا خیال ہے

کہ میں ان گنت لوگوں کا قاتل ہوں۔ لیکن چوں کہ پولیس

کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے آج

تک مجھے گرفتار نہیں کر سکی۔ واضح رہے۔ یہ لوگوں کا خیال

ہے۔ میرا نہیں۔"

"اور آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟ فاروق نے دھک دھک

کرتے دل کے ساتھ کہا۔"

"میں نے تو ایک بھی جان دار کو نہیں مارا۔ اس

مکرا کر کہا۔"

"لیکن بقول پولیس یا لوگوں کے۔ آپ نے اتنے بہت

لوگوں کو قتل کیوں کیا؟"

"ان کا خیال ہے۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ میں ایک

کرائے کا قاتل ہوں۔"

"اوہ۔ گویا جو لوگ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن

ایسا کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ آپ کی خدمات حاصل کرتے

ہیں۔"

"یہ خیال بھی پولیس کا ہے۔ میرا نہیں۔"

"ہوں! ہم سمجھ گئے۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ

تو بہت سنگ دل آدمی ہیں۔"

"اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ کون ہو اور یہاں کیوں

آئے ہو؟"

"ہم انسان ہیں اور گھومتے پھرتے یہاں آئے ہیں۔ فاروق

نے جواب دیا۔"

"میں نے یہ پوچھا تھا کہ کیوں آئے ہو۔ تمہارے جواب

میں کیوں کا جواب نہیں آیا۔"

"گوگا اور سوکھا کا تعاقب کر رہے تھے۔ انہیں اس ہوٹل

میں داخل ہوتے دیکھا تو ہمیں بھی اندر داخل ہونا پڑا،

امید ہے۔ اب کیوں کا جواب مل گیا ہوگا۔ فرزانہ نے منہ

بٹا کر کہا۔"

"کیا مطلب؟ وہ زور سے چونکا۔"

"اب آپ کس بات کا مطلب پوچھ رہے ہیں۔"



”تم لوگ ان کا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟“

”ہماری مرضی۔ آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے۔“

”اے۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے۔“

”ہوگا۔ ہمیں کیا۔“ فاروق نے کندھے اُچکائے۔

”تم یوں نہیں مانو گے۔ اس نے کہا اور اس کی انگلی

ٹریگر پر دباؤ ڈالنے لگی۔

”بڑے عقل مند بن رہے تھے۔ ہو چکی ہے نا بے وقوفی۔ اب

موت کا پھندا تمہارا مقدر ہوگا۔“ فاروق نے پُر سکون آواز

میں کہا۔

”کیا مطلب؟ وہ زور سے چونکا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر

سے اٹھ گئی۔

”ہمیں یہاں گولی مار کر تم پوئیس سے کس طرح بچ

سکو گے۔ آخر یہ ایک ہوٹل ہے۔“

”بے وقوف۔ میرا پستول بالکل بے آواز ہے۔“ وہ بولا۔

”چلو مان لیا۔ بے آواز ہے۔ لیکن ہمارا خون بے آ

نہیں ہے۔“ فرزانہ بولی۔

”بے آواز خون۔۔۔ یہ تو کسی ناول کا۔“ فاروق ہنکا۔

”اچھا۔ ہو سکتا ہوگا نام۔ ہم اس وقت مشر جوار

ماٹا سے بات کر رہے ہیں۔ جو ان گنت انسانوں کا قاتل

ہے۔ اور انسانوں کو قتل کر دینا جس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔“

”اوہ ہاں! یہ تو ہے۔“

”تم دونوں کی لاشیں یہاں سے ہٹا دینا اور خون صاف

کر دینا ذرا بھی مشکل کام نہیں۔ کیوں کہ تم نہیں جانتے۔

کس سے بات کر رہے ہو اور کس کمرے میں بات کر رہے

ہو۔“

”یہ دونوں باتیں تو ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہیں۔“

”نہیں تم نہیں جانتے۔“ اس نے ایک بار پھر ٹریگر پر

دباؤ ڈالا، عین اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔

نکر نہ کریں۔ یہ کہہ کر انپکٹر جمشید ڈاکٹر صاحب کی طرف مڑے اور بولے :

”ڈاکٹر صاحب۔ میں فوری طور پر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس شخص کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ آپ کو جلد از جلد اطلاع دینے کی کوشش کی جائے گی؛ تاہم تفصیلی رپورٹ میں دیر لگے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ وہ بعد میں ملتی رہے گی۔“ وہ بولے۔

اسی وقت ایمبولینس آگئی۔ ڈاکٹر صاحب لاش کے ساتھ ہی چلے گئے۔

”قاسم کی موت سے میں صرف اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ گیند اسی کے ذریعے گھر میں آئی تھی۔ لیکن کس لیے آئی تھی۔ گیند قاسم کو کس نے دی تھی۔ ان باتوں کو راز میں رکھنے کے لیے قاسم کو ہلاک کر دیا گیا۔“

”لیکن کیسے؟ فلک انصاری نے چلا کر کہا۔

”یہ سوال ذرا ٹیڑھا ہے۔ مجھے وہ اجنبی رہ رہ کر یاد آ رہا ہے۔ جو اندر آ گیا تھا۔ اور باہر کا رخ کرتے وقت الجھ کر گرا تھا۔ اور گرا بھی بے ہوش قاسم پر تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، اسی دوران ہوا ہے۔ اس شخص نے کسی سوئی کے ذریعے زہر

## نہیں نہیں

”اس۔ اس کی رگوں میں بل پیل ختم ہو گئی۔“ ڈاکٹر صاحب چلائے۔

”نہ صرف رگوں میں۔ بلکہ جسم میں بھی ختم ہو گئی۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”اوہ ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ بے چارہ مر چکا ہے۔“ فلک انصاری نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

”یہ آپ کے پاس کب سے ملازم تھا؟“

”ابھی۔ کل ہی تو ملازم ہوا تھا۔ اس نے بتایا۔“

”کیا! ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔“

”ہاں! یہی بات ہے۔ یہ کل ہی ملازمت کے لیے آیا تھا۔ مجھے ملازم کی ضرورت تھی۔ بس میں نے رکھ لیا۔“

”یہ۔ اس کی موت سمجھ میں نہیں آئی۔“

”موت تو خیر کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ خیر آپ



اس کے جسم میں داخل کر دیا ہوگا۔

حد درجے پیچیدہ حالات ہیں۔ پروفیسر داؤد بولے۔

وہیے پروفیسر صاحب، اس گیند کے جراثیم کا بھی تو

تجربہ کرنا چاہیے۔ انپیکٹر جمشید بولے۔

اب میں اسی پہلو پر غور کر رہا ہوں۔ اگر تم مناسب

سمجھو تو میں یہ گیند تجربہ گاہ میں لے جاتا ہوں۔

ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ لیکن آپ کو بہت احتیاط کی ضرورت

ہے۔ ہو سکتا ہے، گیند حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اودہ۔ تو پھر اس کا انتظام تم خود کرو۔ انھوں نے

گھبرا کر کہا۔

”اچھی بات ہے۔“

انھوں نے فون کر کے اپنے چند ماتحت بلائے، انھیں

ہدایات دیں اور پروفیسر صاحب کو ان کے ساتھ تجربہ گاہ کی

طرف روانہ کر دیا۔ اسی وقت اکرام کا فون موصول ہوا،

”سر۔ یہ معلوم کر لیا گیا ہے کہ موٹر سائیکل کس کی ہے۔“

”اچھا! میں آ رہا ہوں۔ ابھی اس کی طرف چلتے ہیں۔“

انھوں نے محمود کو ساتھ لیا اور فلک انصاری وغیرہ

کو تسلی دے کر باہر نکل آئے۔ پھر کسی خیال کے تحت

مڑے اور فلک انصاری سے بولے،

”آپ کی کسی سے دشمنی تو نہیں؟“

”یہ۔ یہ کیوں پوچھا آپ نے۔“ وہ گھبرا گیا۔

”ایک خیال کے تحت؟“ وہ بولے۔

”ہاں! میری کچھ لوگوں سے دشمنی ہے۔ اور یہ دشمنی

زمین کے سلسلے میں ہے۔“

”تو پھر آپ گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھیں۔ اور

پوری طرح اطمینان کیے بغیر کسی کے لیے دروازہ نہ کھولیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک اٹھا۔

”میں خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ آپ میرا نام لے

کر پولیس کو بھی بلوا لیں۔“

”اودہ۔ اودہ۔ آپ تو مجھے ڈرائے دے رہے ہیں۔“ فلک

انصاری نے کہا۔

”میرا خیال ہے۔ کہ اب آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں،

خطرہ اب آپ سے قدرے دور چلا گیا ہے۔ بس اس

کو نزدیک نہیں آنے دینا چاہیے۔“

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”اور اس دوران آپ یہ بھی غور کریں کہ وہ کون ہو

سکتا ہے۔ جو آپ کی جان لینے کا خواہش مند ہے۔ میں جلد

آ کر اس کا نام پوچھوں گا۔“

”جی بہتر!“ وہ وہاں سے نکل کر دفتر پہنچے، اکرام کو ساتھ لے کر نکلے ہی گئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کا فون موصول ہوا، وہ کہہ رہے تھے:

”بہتر ہو گا کہ آپ یہیں چلے آئیں۔“

”اوہ اچھا۔“ انہوں نے کہا اور پھر لیبارٹری پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب ان کے منتظر تھے:

”مم۔ میں۔ مگر ہم بہت پریشان ہیں۔“ وہ بڑبڑاتے۔

”خیر تو ہے ڈاکٹر صاحب۔“

”ہم سب سر توڑ کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن قاسم کی موت کا سبب نہیں جان سکے۔ بس اس کی موت قدرتی موت ثابت ہو رہی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا مرنے سے پہلے آپ نے اس کی حالت نہیں دیکھی تھی؟“

”بالکل دیکھی تھی، لیکن یہاں کے تجزیے کی رپورٹ یہی ہے کہ اس کے خون میں کوئی زہر نہیں ہے۔ لیکن جسم پر ایک سوئی کے چبھنے کا نشان ضرور ہے، نشان سے بھی جسم میں زہر نہیں داخل کیا گیا۔“

”معاف کیجیے گا۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“

طور پر بھی جب ایک آدمی مرتا ہے۔ تو اس کی بھی کوئی زکوئی وجہ ضرور بنتی ہے۔ آخر کوئی وجہ تو بتائیے۔“

”ہاں! یہ بات ضرور ہے۔ اس شخص کا ہارٹ فیل ہوا ہے، لیکن دل کے فیل ہونے میں کسی زہر کا قطعاً تعلق نہیں ہے۔“

”ہوں۔ یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے۔“ وہ بڑبڑاتے، پھر اٹھتے ہوئے بولے:

”خیر۔ آپ مزید چھان بین جاری رکھیے۔ میں پھر آپ سے رابطہ قائم کروں گا۔“

اور وہ وہاں سے نکل آئے۔

”ہاں! اکرام۔ کہاں چلتا ہے؟ وہ بولے۔“

”چلیے۔ میں لے کر چل رہا ہوں آپ کو۔“

”تو موٹر سائیکل اس شخص کی ہے جس کے پاس ہم رہے ہیں۔“

”ہاں! یہی بات ہے۔“

ان کی جیب چلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک شان دار گاڑی کے سامنے رکی۔ اکرام نے اتر کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔

ایک ملازم نے دروازہ کھولا:

”ہمارے کارڈ ہیں۔ ملک صاحب کو دے دیں۔“



”جی بہتر؟ اس نے کہا اور کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔

”ملک اختر خالد۔“ محمود نے دروازے پر رکھا ہوا نام

پڑھا۔

”ملازم دوبارہ نمودار ہوا اور انیس ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ جلد ہی ایک پوڑے چہرے والا آدمی اندر داخل ہوا، اس کی آنکھیں جھوری تھیں۔“

”فرمائیے، جناب میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”آپ کے پاس کوئی موٹر سائیکل ہے؟“

”جی ہاں! ہے۔ پھر۔“

”اور اس کا نمبر آئی کے ۵۵۵ ہے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”وہ موٹر سائیکل کہاں ہے؟“

”کل سے گم ہے۔ میں نے اس کا رپورٹ درج کر دیا پھر جیپ میں لگے فون پر جھک گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی

ہے۔ کیا وہ آپ کو ملی ہے؟“

”ہم نے اس کی ایک جھلک ضرور دیکھی ہے۔ آپ نے؟“

”کون سے تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے؟“

”اسی علاقے کے تھانے میں۔ آپ فون کر کے معلوم کرنے لگے۔“

”کر سکتے ہیں۔“

”اوہ ہاں ضرور۔“ انہوں نے کہا اور پولیس اسٹیشن فون

کرنے لگے۔ جلد ہی ملک اختر خالد کی بات کی تصدیق ہو گئی۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کی موٹر سائیکل جرائم پیشہ

لوگوں کے قبضے میں ہے اور وہ اس کو جرائم کے لیے استعمال

کر رہے ہیں۔“

”اوہ! اس کے منہ سے نکلا۔“

”آپ کی کسی سے دشمنی تو نہیں؟“ انپیکٹر جمشید بولے۔

”م۔ میری۔ اس نے گھبرا کر کہا۔“

”ہاں! آپ کی۔“ انپیکٹر جمشید نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

”نہیں جناب۔ میرا کوئی دشمن نہیں۔ میں ایک شریف

شہری ہوں۔ کسی سے میرا جھگڑا نہیں۔“

”شکریہ! انہوں نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔“

”باہر نکل کر انپیکٹر جمشید چند لمحے تک سوچ میں گم رہے،

ملک انصاری کے نمبر گھمائے اور پھر سلسلہ ملنے پر بولے:

”آپ کسی ملک اختر خالد کو جانتے ہیں؟“

”ہاں! بہت اچھی طرح۔ دوسری طرف سے ملک انصاری

”بہت خوب۔ آپ کے اس سے کس قسم کے تعلقات ہیں؟“

”بہت ہی ناخوش گوار۔ یہ صاحب میری زمینیں خریدنے

”بہت ہی ناخوش گوار۔ یہ صاحب میری زمینیں خریدنے

کے خواہش مند ایک مدت سے چلے آ رہے ہیں، لیکن میں اپنی زمینیں فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اس طرح یہ میرے دشمن بن گئے ہیں۔

اور ان کے منہ سے نکلا۔

پھر ریسور رکھ کر باقی لوگوں کو یہ بات بتائی۔ ان کے منہ بھی حیرت سے کھل گئے۔

اب ہمیں متعلقہ تعانے جانا ہوگا۔ تاکہ اپنی آنکھوں سے موٹر سائیکل کی گم شدگی کی رپورٹ دیکھ سکیں۔ انھوں نے کہا۔

پولیس اسٹیشن میں واقعی رپورٹ درج تھی۔ انیکٹر جمشید

نے اکرام سے کہا:

اکرام۔ اس شخص کی چوبیس گنتے گروانی ہونی چاہیے۔

میں ابھی آدمی مقرر کیے دیتا ہوں۔ اس نے کہا اور وہیں

سے اپنے ماتحتوں کو فون پر ہدایات دینے لگا۔

وہ وہاں سے رخصت ہو کر پھر ملک آخر خالد کے ہائی کی بنیاد بھی بنا سکتے ہیں اس چیز کو۔ انیکٹر جمشید نے

پہنچے۔ انھیں دوبارہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ نظر آیا۔

معاف کیجیے گا۔ ہم آپ کو پھر تکلیف دے رہے ہیں۔

کک۔ کوئی بات نہیں۔

آپ نے بتایا تھا کہ آپ کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔

جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔ اس نے فوراً کہا۔

آپ فلک انصاری کو جانتے ہیں؟

نہج۔ جانتا ہوں۔ وہ ہٹکلیا۔

کیا آپ کی ان سے دشمنی نہیں ہے؟

نہیں تو۔ بھلا میری ان سے کیوں دشمنی ہونے لگی۔

اس نے انکار میں زور سے سر ہلایا۔

کیا آپ ان کی زمینیں خریدنے کے خواہش مند نہیں ہیں؟

جی ہاں! یہ بات تو خیر ہے۔

اور۔ فلک انصاری زمینیں فروخت کرنے پر تیار نہیں۔

یہ بھی ٹھیک ہے۔

لہذا آپ لوگوں کی آپس میں دشمنی ہے۔

جی نہیں۔ اس میں دشمنی کی کیا بات۔ زمینیں ان کی

میں زبردستی تو لے نہیں سکتا۔

لیکن اس سلسلے میں دھکیں ضرور دے سکتے ہیں۔ اور

وہ وہاں سے رخصت ہو کر پھر ملک آخر خالد کے ہائی کی بنیاد بھی بنا سکتے ہیں اس چیز کو۔ انیکٹر جمشید نے

پہنچے۔ انھیں دوبارہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ نظر آیا۔

یہ آپ کا یا فلک انصاری کا خیال ہوگا۔ میرا نہیں۔

آپ قاسم کو جانتے ہیں۔ انھوں نے اچانک کہا۔

قاسم۔ کیا مطلب؟ اس نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔



## لمبا آدمی

دباؤ ڈالتی انگلی رُک گئی۔ جواری ماٹا نے سانپ کی طرح پھنکارتی آواز میں کہا:  
"دروازہ کھول دو۔"

یہ کہتے ہوئے بھی اس نے پستول جیب میں نہیں دیکھا۔ اس کی نال بھی ان کی طرف اٹھی رہی۔ اور آنکھیں دونوں پر جمی رہیں۔ ادھر انہوں نے جواری ماٹا کے دونوں ساتھیوں اور مینجر بانکے میاں کی طرف دیکھا۔ وہ اگرچہ ہوش میں تھے، لیکن حرکت کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے۔

"آپ نے یہ جملہ اپنے آدمیوں سے کہا ہے یا ہم سے؟"  
یہ بزدل کیا اٹھیں گے۔ انھیں تو اب دنیا سے ہی اٹھنا ہو گا۔ جواری ماٹا نے منہ بنایا۔

"جی واہ۔ یہ جملہ تو کچھ ادبی قسم کا ہو گیا۔ اور ایک جراثیم پیشہ انسان کی زبان پر ادبی جملہ ذرا عجیب سا لگتا

"قاسم۔ جو کل ہی فلک انفاری کے گھر میں ملازم ہوا تھا۔  
"نن۔ نہیں۔ میں تو اس نام کے کسی آدمی کو جانتا  
جی نہیں۔"

"جی کیوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ کے گھر میں قاسم بہت عرصے تک رہتا رہا ہے۔  
"نن۔ نہیں۔ نہیں۔"

فلک آخر خالہ چلا کر بولا، پھر اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

ہے۔

اسی وقت دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ فاروق مڑا اور پچھنی گرانے لگا۔ اسی لمحے اس نے ترچی نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی دروازے کے بالکل قریب تھی۔ پھر انہوں ہی دروازہ کھلا، ایک بھرا یہ کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”مر۔ آپ کی ہال میں امجد ضرورت ہے۔“

ادھر فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ میرے کو دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل آگے کی طرف گرا۔ دونوں نے ایک ساتھ چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

”خبردار! انہوں نے اپنے پیچھے جواری ماٹا کی آواز سنی۔“

لیکن وہ رُکے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ

ہال میں پہنچ کر دم لیا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟ فرزانہ نے اس کی طرف دیکھا۔“

”یہیں رک کر دیکھتے ہیں۔ جواری ماٹا اب کیا کرتا ہے۔“

فاروق بولا۔

”پتا نہیں۔ یہ جواری ماٹا کیا بلا ہے۔ فرزانہ بڑبڑائی۔“

”وہی بلا ہو گی۔ جو اس نے خود کو بتایا ہے۔“

مسکرا دیا۔

وہ ہال کی ایک میز پر بیٹھ گئے اور انتظار کرتے

رہے، لیکن بہت دیر گزرنے پر بھی نہ جواری ماٹا نظر آیا، نہ مینجر اور دوسرے دو ساتھی۔ یہاں تک کہ وہ میرا بھی نیچے نہ آیا جو ان کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

”یہ لوگ تو رہ گئے اوپر ہی۔“ فرزانہ کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔

”تو پھر۔ کیا اوپر دیکھنے چلیں۔“ فاروق بولا۔

”یہ بے وقوفی ہو گی۔ پہلے اپنے کچھ ساتھی یہاں موجود ہونے چاہئیں۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔“ فاروق نے کہا اور دفتر فون کیا۔

محمد حسین آزاد سے بات ہوئی۔ فاروق نے جلدی جلدی صورت حال بتائی اور ریسور رکھ دیا۔

”محمد حسین آزاد صاحب آ رہے ہیں۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔“

آخر محمد حسین آزاد اپنے ماتحتوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

انہوں نے اوپر کا رخ کیا۔ جواری ماٹا کے کمرے کا

دروازہ چوہٹ کھلا تھا اور اس میں کوئی بھی نہیں تھا۔

”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ محمد حسین آزاد بڑبڑایا۔

”تب پھر وہ اوپر ہی اوپر کہاں غائب ہو گئے؟“ فاروق



بولے۔ "میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہاں آپ لوگ تھے، میں نہیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"ہوٹل سے باہر نکلنے کے کئی راستے ہو سکتے ہیں، لیکن جواری ماٹا بھاگنے والا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا، اس لیے ہم اسی خیال میں تھے کہ وہ بھاگا نہیں۔ اوپر ہی ملے گا۔" فاروق نے کہا۔

"کون۔ کون۔ کیا نام لیا آپ نے؟"

"جواری ماٹا۔"

"ارے باپ ارے۔" محمد حسین آزاد نے کانپ کر کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"وہ تو بہت بدنام آدمی ہے۔ انسانی جانوں سے"

کیلنے والا۔"

"لیکن ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔" فرزانہ بولی۔

"انہوں نے پورے ہوٹل کی تلاشی لی، لیکن ان

میں سے کسی کا نام و نشان تک نظر نہیں آیا۔ آخر نالائق

ہو کر واپسی کی سوچی۔

"ابا جان کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ وہ کہاں ہیں

ہاں! اکرام صاحب انہیں ساتھ لے کر ایک شخص کے

آخر خالد سے ملنے گئے ہیں۔ قاسم کو ہلاک کرنے والا شخص جس موٹر سائیکل پر سوار ہو کر آیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل اس کی ثابت ہوئی ہے۔"

"اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ پولیس جیپ میں اس طرف روانہ ہو گئے، لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

"ہوشیار فاروق۔ تعاقب کرنے والی اس کار کے تیلور خطرناک ہیں۔" فرزانہ چلائی۔

"ہاں! میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔ وہ آندھی اور

طوفان کی طرح ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ انکل آزاد۔

کیا آپ اس تیز رفتاری کا ساتھ دے سکتے ہیں؟"

"ہاں! کیوں نہیں۔ ابھی لیجیے۔" محمد حسین آزاد نے کہا اور

خود بھی رفتار یک لخت بڑھا دی۔

"انہیں جھٹکا لگا اور جیپ ہوا ہو گئی۔"

"ویری گڈ۔ ہم تو آپ کو۔" فاروق کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں! ہاں۔ کیسے۔ رک کیوں گئے۔ آپ تو مجھے فضول آدمی

خیال کرتے رہے ہیں۔ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔"

"نہیں خیر۔ میں یہ تو نہیں کہنے والا تھا۔ خاک ڈالے

اس پر اور اس کار سے بچنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے

ڈرائیور کی کوشش ہے کہ کسی طرح ہم سے آگے نکل جائے۔  
صاف ظاہر ہے۔ آگے نکلتے ہوئے وہ ہم پر فائرنگ  
کرے گا۔ فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

”تو پھر کیوں نہ ہم بھی اس پر فائرنگ شروع کر دیں“  
محمد حسین آزاد نے کہا۔

”نہیں! اس صورت میں ہم شاید اس کار کے ڈرائیور  
سے زندہ حالت میں نہ مل سکیں۔ جب کہ ہم چاہتے ہیں  
اس سے بات چیت کریں۔ پوچھیں، آخر اسے تعاقب کی اس  
کیا خاص ضرورت پڑ گئی ہے؟“ فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
ان کی جیب شہر سے باہر نکل گئی۔ تعاقب کے جگر  
میں وہ اس طرف نہیں مڑ سکتے تھے، اس طرف انھیں جانا  
تھا۔

”لو بھئی۔ شہر سے باہر آ گئے۔ اب سوچو کیا مقابلہ ہے۔“  
فاروق خوش ہو کر بولا۔

”کیوں نہ۔ اچانک رُک کر اس کا سامنا کر لیا جائے۔“  
فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

”اب یہی مناسب رہے گا۔“ فاروق بولا۔

”انکل۔ کیا آپ ایسا کر سکیں گے؟“

”ہاں! کیوں نہیں۔ تیار ہو جائیے۔“

موقع ملتے ہی محمد حسین آزاد نے پورے بریک لگائے۔  
اور پھر وہ دروازے کھولتے ہوئے بائیں طرف لڑھک گئے۔  
توڑا ہی پھٹی کار زن کر کے گزر گئی اور ساتھ ہی ایک  
دھماکا ہوا۔ ان کی جیب کے پرچھے اڑ گئے۔  
”ارے باپ دے۔ اس نے تو ہم مارا ہے جیب پر۔“  
فرزانہ کانپ گئی۔

”چلو اچھا ہی ہوا، ہم جیب پر نہیں تھے۔“ فاروق بولا۔  
”لیکن اب ہم شہر کیسے جائیں گے؟“ محمد حسین آزاد بڑبڑایا۔  
”پپ۔ پیدل۔“ فاروق بولا۔

انھوں نے تباہ ہونے والی جیب کا جائزہ لیا۔ اس میں  
سے اب انھیں کام کی کوئی چیز ملنے کی امید نظر نہیں آتی،  
چنانچہ ان کے قدم شہر کی طرف اٹھنے لگے۔ اچانک فرزانہ  
چلائی :

”گرا دو خود کو۔“

اس جھلے میں نہ جانے کس قدر خوف تھا۔ وہ تڑپ  
رہے تھے اور لڑھک گئے۔ تعاقب کرنے والی کار اسی  
جگہ سے گزر گئی۔ جس جگہ وہ ایک لمحہ  
نے چل رہے تھے :

”اُف مالک۔ موت گویا ہمیں چھو کر گزری ہے۔“ فاروق نے



کانپ کر کہا۔

”اور وہ پھر مڑ رہا ہے۔“ محمد حسین بولا۔

”یقیناً نہیں۔ کیا ہو گیا ہے اس شخص کو۔ کہیں پاگل

تو نہیں ہو گیا۔“ فرزانہ نے فکر مندانہ انداز میں کہا۔

”یہ صرف ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے پر تمل گیا ہے، اور کوئی بات نہیں۔“ فاروق نے مسی صورت بنا کر کہا۔

اب وہ لڑھکتے ہوئے درختوں کی اداسی میں ہو گئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ ہی کیا سکتے تھے۔ تعاقب

کرنے والی کار کا رنگ سرخ تھا۔ وہ ان کے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اور پھر کوئی گول سی چیز درختوں

کی طرف پھینکی گئی۔ درختوں کے درمیان ایک ویسا ہی دھماکا اور ہوا۔ گر د کا ایک بارل اڑا اور دو درخت گر

گئے۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ ان دونوں درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے نہیں تھے۔

پھر انہوں نے ایک لمبے قد کے آدمی کو چھلانگ لگا کر نیچے اترتے دیکھا۔ ساتھ ہی محمد حسین آزاد نے جیب سے

پستول نکال لیا، لیکن فاروق نے انکار میں سر ہلا کر کہا: ”پستول سے فاروق نہیں کرنا۔“

لمبا آدمی اندھا دھند درختوں کی طرف چلا آیا۔ شاید اسے یقین تھا کہ اس کے پھینکے ہوئے دستی بم نے ان سب کو ہلاک یا پھر کم از کم زخمی ضرور کر دیا ہے۔ اپنی رو میں وہ ان سے آگے نکل گیا۔ انہوں نے اس لمبے آدمی کو جواری ماٹا کے آس پاس نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی یہ اس ہوٹل کے ڈال میں کہیں نظر آیا تھا، لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ اس آدمی کا تعلق جواری ماٹا سے ہی ہے۔

اب وہ ان کی زد پر تھا۔ فرزانہ نے اچانک اس کی طرف دوڑ لگائی، اس کا سر پورے زور سے لمبے آدمی کی کمر سے ٹکرایا۔ وہ دھبے سے گرا۔ ادھر فاروق اور محمد حسین اس کی طرف بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے اس کی پشت ایک ٹانگ پکڑ لی۔ اب وہ اٹھ نہیں سکتا تھا۔ ہاتھوں کے بل وہ پلٹا اور غرا کر بولا:

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“

”اور تمہارے خیال میں بم پھینکنا تمیز کی کون سی قسم ہے؟“ فاروق مسکرایا۔

”تو تم بھی مجھ پر وار کرو، حملہ کرو۔ فاروق کرو۔ یہ کہ میری ٹانگیں پکڑ لیں۔ اس نے جھلٹائے ہوئے انداز

میں کہا۔

ہمارا وار کرنے کا کچھ ایسا ہی انداز ہے۔ اس انداز کو  
میر اور شکر کے ساتھ قبول کر لیں۔" فرزانہ بولی۔

"چلو فرزانہ اپنا کام کرو۔" فاروق بولا۔

"اپنا کام۔ کیا مطلب؟" محمد آدھ بولا۔

"اجبی مطلب بھی معلوم ہو جاتا ہے۔" فاروق نے کہا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی فرزانہ نے چھلانگ لگائی اور  
اس کے دونوں پیر اس کی کمر پر آکر لگے۔ ساتھ ہی وہ  
اچھلی اور پھر کمر پر گئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ چلایا۔

"فرزانہ اس وقت تک اچھل کود جاری رکھو۔ جب تک  
کہ یہ اپنے بارے میں ہر بات سنانے پر تیار نہ ہو جائے۔  
فاروق نے تیز آواز میں کہا۔

"بہت بہتر۔ میں حکم کی تعمیل کروں گی۔" فرزانہ نے  
کہا اور زور زور سے اچھلنے لگی۔

"ٹھہرو۔" آخر اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔  
"ٹھہر جاؤ فرزانہ۔ پہلے اس کی بات سن لو۔" فاروق  
مسکرایا۔

فرزانہ رُک گئی۔ اور یہی اس کی غلطی تھی۔ اس کے

کہتے ہی لمبے آدمی کا ایک ہاتھ اس کی ٹانگ پر آجھا۔ دوسرے  
ہاتھ نے فرزانہ دھڑام سے ایک طرف گری۔ اور اس نے دونوں  
ہاتھوں سے اسے دبوچ لیا۔ پھر اس کی انگلیاں فرزانہ کی  
سلی کی ہڈی کے پاس دھنستی چلی گئیں۔ فرزانہ کا چہرہ  
سرخ ہو گیا، تاہم اس نے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی،  
فاروق بے چین ہو گیا۔ اس نے لمبے آدمی کی ٹانگ کو زور  
سے مروڑا۔ ادھر محمد حسین نے بھی یہی کیا۔

"کچھ بھی کر لو۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ پہلے تم  
یہی ٹانگیں چھوڑو گے، پھر میں اسے چھوڑوں گا۔" اس نے  
آکر کہا۔

فاروق نے فوراً اس کی ٹانگ چھوڑ دی۔ محمد حسین نے  
اسی دیر نہ لگائی۔

بہت خوب۔ یہ ہوئی بات۔ اس نے کہا اور فرزانہ کو  
بہت بہتر۔ میں حکم کی تعمیل کروں گی۔" فرزانہ نے  
کہا اور زور زور سے اچھلنے لگی۔

"ٹھہرو۔" آخر اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔  
"ٹھہر جاؤ فرزانہ۔ پہلے اس کی بات سن لو۔" فاروق  
مسکرایا۔

فرزانہ رُک گئی۔ اور یہی اس کی غلطی تھی۔ اس کے



”آخر جواری ماٹا کو ہم سے کیا خوف ہے۔ اس کے خلاف تو کسی کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں۔“ فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”پتا نہیں۔ تم کیا باتیں کر رہے ہو۔“

”تمہارے پاس کا نام جواری ماٹا ہے۔ یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور تم بھی جانتے ہو۔“

”خیر۔ یوں ہی سہی۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ پاس ایسا کیوں چاہتا ہے، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو ختم کرنا ہے یا خود ختم ہونا ہے۔“

”تو پھر مہربانی فرما کر خود ہی ختم ہو جاؤ، ہمیں تکلیف نہ دو۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”جب تک میری جان میں جان ہے، اس وقت تک میرے تم لوگوں کو ختم کرنے پر تیار رہوں گا۔“ وہ بولا۔

”اور اس کام کا صلہ کیا ملے گا تمہیں اپنے پاس سے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ لیکن اگر میں اس کا یہ کام نہ کر سکا تو وہ مجھے پھانسی پر ضرور چڑھوا دے گا، کیوں کہ اس نے میرے ہاتھ سے ایک آدمی کا خون کروایا تھا اور خون کے وقت میری تصاویر بھی آثار لی تھیں۔ وہ تصاویر اس کے پاس ہیں۔“

”اوہ۔ گویا وہ تمہیں بلیک میل کر رہا ہے۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”تمہارا نام کیا ہے۔ اور وہ کون شخص تھا۔ جس کو تم نے ہلاک کیا تھا۔“

”میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔“

”اچھا تو پھر۔ اب کیا پروگرام ہے؟“

”میرے پاس ایک بم اور ہے۔ اور باتوں باتوں میں وہ بم میں نے نکال لیا ہے اور اب میں وہ تم لوگوں پر پھینک رہا ہوں۔“ اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے مذاق کر رہا ہو، لیکن دوسرے ہی لمحے ایک گول چیز فضا میں تیرتی

ان کی طرف آتی نظر آئی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی جگہوں سے چھلانگیں لگا دیں۔ بم پٹا۔ دھماکا ہوا۔ گرد کا بادل اڑا۔

لیکن وہ بال بال بچ گئے۔ بم زیادہ طاقت کے نہیں تھے، انہیں بچتے دیکھ کر لمبے آدمی کا منہ بن گیا۔ اور اب اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ

فائر کرتا۔ محمد حسین کے پستول کی نال سے ایک گولی نکلی اور اس کے ہاتھ سے خون بہتا نظر آیا۔ پستول کہیں دور

ہٹ گیا۔

”بس۔ اب ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“ فاروق بولا۔

"میں ہاتھ اٹھا کر کیا کروں گا۔ تم مجھے گولی مار دو۔ بعد میں بھی تو پھانسی چڑھوں گا۔" اس نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ ہم تمہیں گولی نہیں ماریں گے، بلکہ زندہ گرفتار کریں گے۔"

"تو پھر یہ لو۔"

اس نے کہا اور سڑک کی طرف دوڑ نکلا دی۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اسے دوڑتے دیکھ کر وہ لوگ گولی چلا دیں۔ محمد حسین آزاد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں نے نفی میں سر ہلاتے اور اس کی طرف دوڑ پڑے۔

"یا تو تم مجھے گولی مارو گے۔ یا میں بھاگ نکلوں گا۔" زندہ تم لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔" اس نے دوڑ کر کار میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کار ٹمک پہنچتے۔ کار ہوا ہو چکی تھی۔ اب انھوں نے دیکھا، ایک سفید کار آ رہی تھی۔ فادانے نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کار رک گئی۔

جلدی جلدی انھوں نے ڈرائیور کو صوبتِ حال بتائی۔ دوسرے ہی لمحے سفید کار بھی پوری دفاتر سے سڑخ کار کے پیچھے اڑی جا رہی تھی۔ شہر سے تو وہ پہلے ہی باہر نکل چکے تھے۔ اب اور دور ہوتے چلے گئے۔ درمیانی فاصلہ کافی تھا۔ کار

ڈرائیور کوشش کے باوجود اس فاصلے کو کم نہ کر سکا۔ اور ایک بار تو فاصلہ اس قدر بڑھ گیا کہ سڑخ کار ایک دھبہ سا دکھائی دینے لگی۔

"آپ ذرا رفتار بڑھائیے نا۔ وہ تو نظروں سے اوجھل ہوتی نظر آ رہی ہے۔" فرزانہ بولی۔

اور پھر دھبہ ایک موڑ مڑ گیا۔ جب وہ اس موڑ پر پہنچے تو سڑخ کار سڑک کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ لمبا آدمی کار میں نہیں تھا۔ وہ بھی اس کے عین پیچھے جا کر رک گئے۔ سڑک کے دونوں طرف درخت تھے۔ گھنے اور بڑے۔

اور دائیں طرف درختوں کے درمیان ایک اونچی عمارت نظر آئی۔ انھوں نے سوالیہ نظروں سے اس عمارت کی طرف دیکھا۔ کار سے اتر کر ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا، پھر غیبی طور پر ان کے قدم اس عمارت کی طرف اٹھنے لگے۔

عمارت کے دروازے پر پہنچ کر ان کی نظریں نام کی تختی پر جم گئیں۔ لکھا تھا:

"ڈاکٹر ارماط۔"

"ڈاکٹر ارماط۔" تینوں بڑبڑائے۔

"یہ کیا بلا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"بلا نہیں۔ ڈاکٹر۔ ہم ایک ڈاکٹر کو بلا رہے ہیں۔"



کئے اور نہ بلا کو ڈاکٹر۔ ویسے میرا خیال ہے۔ یہاں کوئی ڈاکٹر  
ڈاکٹر نہیں رہتا۔ فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

”تم کس طرح کر سکتے ہو؟“ فرزانہ نے منہ بنایا۔

”تم دیکھ نہیں رہیں۔ ہر طرف گرد ہی گرد ہے۔  
دروازے بھی گروہ سے اٹھ ہوئے ہیں۔“

”او۔“ فرزانہ بولی اور بے دھڑک دروازے کی طرف  
بڑھے۔ اس نے دستک دی۔ پھر ایک منٹ گزرنے پر  
بھی دستک کا جواب نہ ملا۔ آخر اس نے دوسری اور تیسری  
بار دستک دی۔

”اندر کوئی ہو تو دروازہ کھولے بھی۔“ محمد حسین آزاد نے  
مناکر کہا۔

”لیکن لمبا آدمی آخر اس طرف کیوں آیا۔ کیا اس کا پیلے  
سے اس طرف آنے کا پروگرام تھا۔ ہم اس عمارت کو اندر  
سے دیکھے بغیر نہیں جائیں گے۔“

”سوال یہ ہے کہ اندر داخل کس طرح ہوں؟“ فرزانہ نے کہا  
اور بے خیالی میں دروازے پر دباؤ ڈال دیا۔ دروازہ کھل  
گیا۔

”ارے! حیرت ہے۔ دروازہ تو اندر سے بند نہیں ہے۔“  
”تب وہ لمبا آدمی اندر ہی ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں،“

اب اس کے پاس نہ کوئی پستول ہے اور نہ بم۔“

تینوں اندر داخل ہوئے۔ محمد حسین گھبرایا ہوا تھا، لیکن  
فرزانہ اور فاروق پُرسکون تھے۔ دروازہ کھلتے ہی ان کے سامنے  
ایک لمبا برآمدہ نظر آیا۔ دائیں طرف ایک زینہ اوپر جا رہا  
تھا۔ جب کہ بائیں طرف دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں کے دروازے  
پر تالے لگے ہوئے تھے۔ ان کے قدم زمین کی طرف اٹھ گئے:  
”مم۔ میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔“ محمد حسین آزاد نے  
کانپ کر کہا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں انکل۔ موت کا ایک دن مقرر  
ہے۔ بلکہ ایک ایک لمحہ تک مقرر ہے۔“ فاروق مسکرایا۔

”یعنی اسی وقت انہوں نے ایک آواز سنی۔ ان کے کان  
لھڑے ہو گئے۔ آواز دروازہ بند ہونے کی تھی۔ وہ جلدی  
سے واپس مڑے اور دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن  
اس مکان کا دروازہ۔ جو اندر سے کھلا ملا تھا۔ اب باہر سے  
بند کر دیا گیا تھا۔“

گویا وہ اس مکان میں قید ہو چکے تھے۔

ہوں۔ یہ کوٹھی آپ کی اپنی ہے یا کرائے کی؟  
 "میری اپنی ہے۔ اس نے منہ بنایا۔

"اور آپ کا نام ملک اختر خالد ہے؟  
 "یہ بات بھی ٹھیک ہے، لیکن آخر آپ کتنا کیا چاہتے  
 ہیں؟ ملک اختر خالد بولا۔

"اگر یہ کوٹھی آپ کی اپنی ہے۔ اور قاسم سے آپ کا کوئی  
 تعلق نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ انپکٹر جنرل کتے  
 کتے رک گئے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ  
 ان کا خاص انداز تھا، جب کوئی خاص بات کہنے لگتے  
 تو ذرا دیر کے لیے رکتے ضرور۔

"آپ رک کیوں گئے؟ ملک اختر نے بے چین ہو کر کہا  
 بے چین محمود اور اکرام بھی کم نہیں تھے، لیکن انہوں  
 اپنے ہونٹ بند کر رکھے تھے۔

"پہلے یہ سن لیں کہ میں اس کوٹھی میں آج سے پہلے  
 کبھی داخل نہیں ہوا۔"

"چلیے۔ مان لی یہ بات۔ پھر اس سے کیا۔"

"جو بات میں کتنا چاہتا ہوں۔ اس سے فوری طور پر  
 یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ میں یہاں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔"

"آپ میری الجھن میں ہر لمحے اضافہ کر رہے ہیں اور یہ

## ذرات

ملک اختر خالد کی اڑتی رنگت دیکھ کر محمود اور اکرام حیرت  
 رہ گئے۔

"آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟ جھڈ لے بعد ملک اختر خالد نے  
 کہا۔

"یہ کہ قاسم اس گھر میں آپ کے ساتھ بہت عرصہ تک  
 رہتا رہا ہے۔"

"آپ یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ اس نے الجھ کر  
 کہا۔

"پہلے آپ بتائیے۔ یہ بات درست ہے یا نہیں؟  
 "آپ اٹنا مجھ سے پوچھ رہے ہیں، آپ نے ایک دعویٰ

کیا ہے۔ ثبوت بھی آپ کو دینا ہو گا۔ ملک اختر خالد نے  
 بتا کر کہا۔

"ہاں! بات ٹھیک ہے۔ خیر۔ میں ہی ثبوت دیے دیں۔"



کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

”اے میں محسوس کر رہا ہوں۔ کہ آپ بہت بے چین ہو چکے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اکرام کی طرف مڑے :

”اکرام۔ دیکھاؤ میں سے انہیں قاسم کا اصلی چہرہ دکھاؤ۔“

”جی۔ بہتر!“ اکرام نے فوراً کہا، پھر کمرے سے نکل گیا، دیکھاؤ تو وہ جیب میں چھوڑ آیا تھا۔ جلد ہی اس کی واپسی ہوئی اور قاسم عرف راؤں کی تصویر اس کے سامنے کر دی۔

پسند لے کر ایک ملک اختر خالد چٹھی چٹھی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھتا رہا، پھر جھڑائی ہوئی آواز میں بولا :

”یہ بات نہیں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

”اب آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ ساری بات سمجھ چکے ہیں۔ محمود، اکرام تم بھی قاسم کے نقوش کا بخور جا تڑھ لو۔ فوراً جان جاؤ گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

دونوں کی نظریں بھی تصویر پر جم گئیں۔ پھر انہیں ایک عجیب سی حیرت کا احساس ہونے لگا۔ آخر محمود نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا :

”حیرت ہے۔ اس کے نقوش تو مٹا اختر خالد سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔“

”ہاں! لیکن بظاہر نہیں۔ بظاہر دونوں کے چہرے بالکل مختلف ہیں، لیکن جب غور سے دیکھا جائے تو حیرت انگیز مشابہت کا احساس ہوتا ہے۔ لہذا میرا دعویٰ ہے کہ قاسم عرف راؤں مٹا اختر خالد کا بھائی تھا اور چوں کہ یہ کوٹھی ان کی اپنی ہے۔ کرائے کی نہیں ہے تو ان کا بھائی بھی آخر یہیں رہتا رہا ہوگا۔“

”اوہ۔ اوہ۔“ محمود اور اکرام کے منہ سے نکلا، لیکن ملک اختر کو تو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

”اب آپ کیا کہتے ہیں ملک صاحب؟“

”ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ قاسم میرا بھائی ہے اور وہ ایک زمانے میں یہاں رہتا رہا ہے، لیکن اب وہ میرے ساتھ نہیں رہتا۔“

”اب وہ بے چارہ کسی کے بھی ساتھ نہیں رہ سکتا، کیوں کہ دوسری دنیا کو سدھار گیا ہے۔“

”کیا!“ ملک اختر پوری قوت سے چلا یا۔

”ہاں! فلک انصاری کی کوٹھی میں اس کی موت واقع ہو گئی ہے۔“

”لیکن۔ کیسے؟ وہ بولا۔

”ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اس کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔“

”نہن۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے لڑکتی آواز میں

کہا۔

"کیوں۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ کیا اسے ہمیشہ زندہ رہنا تھا؟  
انپکٹر جیشد بولے۔

ملک اختر خالد کے مزے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

"آپ کا بھائی قاسم۔ ڈاکٹر ارمات کا معاون بھی رہا ہے؟  
"ہاں! وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ سائنس کا طالب علم  
تھا۔ پھر مسٹن میں آیا کہ اس نے ڈاکٹر ارمات کے ہاں نوکری  
کر لی ہے اور اپنا نام راون رکھ لیا ہے۔" اس نے بتایا۔  
"مسٹن میں آیا۔ کیا مطلب۔ کیا یہ بات اس نے خود  
نہیں بتائی تھی؟

"نہیں۔ جب سے وہ یہاں سے گیا تھا، پھر اس نے  
اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے۔ آپ نے یہ بات کسی دوسرے سے  
سُنی تھی؟ محمود نے کہا۔

"جی ہاں! بالکل۔"

"شکریہ۔ اب یہ بھی بتا دیں کہ کس سے سُنی تھی؟

"یہ نہیں یاد۔" اس نے کہا۔

"آپ کا کہنا ہے کہ ملازمت کرنے کے بعد وہ آپ سے  
ملنے نہیں آیا۔ ٹھیک ہے۔"

"ہاں! ٹھیک ہے۔"

"اس نے کبھی فون پر بھی بات چیت نہیں کی؟

"جی نہیں! اس نے فوراً کہا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپ میری بات سُن کر چونکے کیوں  
تھے، آپ نے قاسم کا نام سُن کر یہ کیوں کہا تھا۔ قاسم، کون  
قاسم۔"

"آپ کو تو معلوم ہی ہو گا۔ قاسم یعنی راون پر ایک آدمی  
کے قتل کا الزام ہے۔ قتل، مرنے والا بھی ڈاکٹر ارمات کا  
نائب تھا۔ اسی روز سے ڈاکٹر ارمات اور قاسم نائب ہیں۔  
ان حالات میں کون ان سے اپنا تعلق ظاہر کرنا پسند کرے  
گا؟ ملک اختر خالد نے جلدی جلدی کہا۔

"ہاں! یہ بات آپ کی ٹھیک ہے۔ خیر۔ تو آپ اس بات  
کو تسلیم کرتے ہیں کہ قاسم آپ کا بھائی تھا؟  
"ہاں! بالکل۔"

"اور آپ سے الگ ہونے کے بعد پھر کبھی آپ سے  
ملاقات ہوئی؟

"نہیں! میں نے تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"بہت بہت شکریہ۔ اب ہمیں اجازت دیں! انپکٹر جیشد نے  
ما اور اٹھ کھڑے ہوئے۔



وہ انہیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ باہر نکل کر انہوں نے اپنے چند ماتحتوں کو ہدایات دیں۔ انہیں اکرام نے فون کر کے نگرانی کے لیے بلایا تھا۔ اور اس کے بعد گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

"میرا خیال ہے۔ فاروق اور فرزانہ اب تک گھر آچکے ہوں گے۔" وہ بولے۔

"امید تو یہی ہے۔" محمود نے کہا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" اکرام نے پوچھا۔

"بھئی ابھی تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

گھر پہنچنے پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ دونوں ابھی تک نہیں لوٹے۔

"حیرت ہے۔ وہ کہاں رہ گئے؟" انیسٹر جمشید بڑبڑاتے۔

"میں گھبراہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ کس وہ چسپ نہ گئے ہوں۔"

کیونکہ ہم ان کی تلاش میں نکلیں۔" محمود جلدی جلدی بولا۔

"ہوں! ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔"

انہیں تلاش کرتے ہوئے وہ فلک انصاری کے گھر۔

آئے۔ پھر سڑک کا جائزہ لیا گیا۔ ایک جگہ قدموں کی دگر

کے نشان نظر آئے۔ انہوں نے جھک کر خود سے جائزہ لیا

وہاں پاؤڈر کے کچھ ذرات بھی نظر آئے۔ فاروق کی یہ خاص

تھی۔ رومال میں تھوڑا سا پاؤڈر رکھ دیتا تھا اور جب کسی کے تعاقب میں نکلنے لگتا۔ اس جگہ اس رومال میں سے تھوڑا سا پاؤڈر نیچے گرا دیتا۔ اور اس طرح تعاقب کی سمت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

"یہ ذرات بتا رہے ہیں کہ وہ اس طرف گئے ہیں، لہذا

ہم بھی اسی طرف چلتے ہیں۔" انیسٹر جمشید نے کہا۔ اور اکرام نے

جیب آگے بڑھا دی۔ یہاں تک کہ شہر سے باہر نکل گئے۔

ایک جگہ انہیں سرخ کار کھڑی نظر آئی۔ اس کے پاس ہی

ایک جگہ قدموں کی دگر کے نشان نظر آئے، وہاں بھی پاؤڈر

کے کچھ ذرات پڑے تھے۔ وہ چونک اٹھے، پھر درختوں

کے درمیان ایک عمارت بھی نظر آئی۔ اب تو وہ جوش میں بھر

گئے۔

جیب سے اتر کر عمارت کی طرف بڑھے۔ دروازہ باہر

سے بند تھا، انہوں نے پہلے تو ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔

پھر دروازے پر دھک دے ڈالی۔ چند لمحے تک کوئی جواب

نہ ملا، پھر فرزانہ کی آواز سنائی دی:

"ہم اندر ہیں آبا جان، لیکن دروازہ تو باہر سے بند ہے،

آپ شوق سے کھول سکتے ہیں؟"

"دیری لگے۔"

دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ نام کی تختی پہلے ہی پرچہ چکے تھے :

”تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟ انپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔  
”سُراخِ رسانی“ فاروق مسکرایا۔

”یہ سُراخِ رسانی کا کون سا طریقہ ہے؟“

”جی ہاں۔ وقت پر جو بھی طریقہ سوچے گی۔“

”جلدی بتاؤ۔ یہاں تک کس طرح پہنچے؟“

”اور فاروق نے اپنی کہانی سنا دی۔“

”جواری مالٹا، انپکٹر جمشید اور اکرام ایک ساتھ بولے اور

ان کے منہ بن گئے۔“

”کیوں آبا جان۔ خیر تو ہے۔“

”اس شخص کا بہت نام سنا ہے۔ اس کی طرف توجہ

دینے کا آج تک موقع نہیں ملا، لیکن شاید اس کیس میں اس

سے ہی سامنا ہوگا۔“

”ہمیں یقین ہے۔ وہ لبا آدمی اسی کا آدمی تھا۔ اور اس

نے اسے یہی حکم دیا تھا کہ ہمیں ختم کر دے، لیکن وہ ایسا

ذکر سکا اور آخر یہاں قید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شاید

اس نے سوچا تھا کہ ہم یہاں جھوٹے پیا سے مرہی تو جائیں

گئے۔ خُزاد نے جلدی جلدی کہا۔

”ہم اس تجربہ گاہ کا جائزہ لیں گے۔ بلکہ یہاں پروفیسر  
داؤد کو بھی آنے کی دعوت دیں گے۔ شاید وہ ہمیں کوئی مفید  
بات بتا سکیں۔“

اکرام نے باہر نکل کر جیپ سے انہیں فون کیا۔ اس

دوران انہوں نے پوری تجربہ گاہ کا جائزہ لیا، اس کمرے کو

بھی دیکھا۔ جس میں لاش پائی گئی تھی۔ پھر پروفیسر صاحب بھی

آگئے۔ انہوں نے بھی جائزہ لیا اور آخر بولے :

”جمشید۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر ارماٹ ایکہ سائنسدان

ہی ہے۔ اس میں جھلا جیتیں تھیں۔ اب معلوم نہیں۔ یہاں

کیا حالات پیش آئے۔ کیا ہوا اور اب وہ کہاں ہے۔“

”یہ معلوم کرنا ہمارا کام ہے پروفیسر صاحب۔ فکر نہ

کریں۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

یہاں سے فارغ ہو کر وہ گھر پہنچے۔ اسی وقت دائرہ

ایک پیغام ملا۔ اس پیغام کے ملتے ہی وہ اٹھ کر

کھڑے ہو گئے۔

”ہمیں اسی وقت چلنا ہو گا۔“

”کیا مطلب۔ آپ کھانا بھی نہیں کھائیں گے۔“

”نہیں۔ فرض کی ادائیگی زیادہ ضروری ہے۔ مجرم نکل

نہ جائے۔“



"تب پھر میں بھی نہیں کھاؤں گی۔ تاکہ فرض کی ادائیگی میں کچھ حصہ میرا بھی ہو جائے۔" بیگم جمشید مسکرائیں۔

"شہر۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن اس حد تک انتظار نہ کرنا کہ جھوک سے آنتوں میں بل بڑ جائیں۔" انپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ باہر نکل آئے۔

آدھ گھنٹے کا سفر کر کے وہ سمندر کے کنارے کھڑی پٹانوں پر پہنچے۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ انپکٹر جمشید نے ہر طرف نظر دوڑانے کے بعد کہا:

"میں خطرے کی بڑ سونگھ رہا ہوں۔ آدھ گھنٹے کے اندر ہمیں پھر نمبر ۱۳ کا کوئی پیغام نہیں ملا۔ اس صورت میں تو اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔ لہذا صاف ظاہر ہے۔ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔"

"اوہ! ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔"

"ہمیں ان پٹانوں کا جائزہ لینا ہو گا۔"

پٹانوں کا جائزہ شروع ہوا، لیکن کہیں کسی کے آثار نظر نہ آئے۔

"ہو سکتا ہے۔ اسے افراتفری کے عالم میں یہاں سے رخصت ہونا پڑا ہو۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں۔ اطلاع دیے بغیر وہ یہاں سے ہٹ ہی نہیں

سکتا تھا۔ اسے ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ ہمیں اور کوشش کرنا ہو گی۔"

وہ پٹانوں میں مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ اچانک انہوں نے محمود کی آواز سنی:

"آبا جان۔ میں یہاں خون کے قطرات دیکھ رہا ہوں۔"

سب اس طرف دوڑ پڑے۔ واقعی خون کے کچھ قطرات موجود تھے اور ایک سمت میں چلے گئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے رہے۔ اچانک قطرات نظر آنا بند ہو گئے؛ تاہم سمت کا اندازہ تو لگ ہی گیا تھا۔ وہ اس سیدھ میں آگے بڑھتے رہے، پھر پٹانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سمندر کی چالیں ان کا منہ چڑانے لگیں۔

"یہ کیا ہوا بھتی! انپکٹر جمشید بولے۔"

"ہم نے ایک ہی سمت میں کوشش کی ہے۔ دوسری سمت میں نہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"کیا مطلب؟"

"جس جگہ ہمیں خون کے قطرات نظر آئے تھے۔ ہم اس جگہ سے اس سمت میں چل پڑے۔ جس سمت میں قطرات گرتے

چلے گئے تھے۔ اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئے۔ جس کے آگے قطرات نہیں تھے۔ تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ قطرات اس جگہ سے

شروع ہوئے ہوں۔ اور اس سمت میں گئے ہوں جس طرف  
سے ہم آئے ہیں۔  
"اوہ ہاں واقعی۔ یہ عین ممکن ہے۔" انیکٹر جمشید پُر جوش  
انداز میں بولے۔

اور وہ اس سمت میں چل پڑے۔ قطرات نظر آنے بند  
ہو گئے۔ اس کے باوجود وہ چلتے رہے۔ اور پھر ایک جگہ  
رک جانا پڑا۔ وہاں نمبر ۱۲ بے ہوش پڑا تھا۔  
"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا،" انیکٹر جمشید بڑبڑاتے۔  
"اب پہلے تو اسے ہوش میں لانا ہوگا۔ محمود بڑبڑایا۔  
انہوں نے اسے ہلایا جلا یا۔ آخر چند منٹ کی کوشش کے  
بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔  
"مم۔ میں۔ میں۔" وہ ہکا بکا۔  
"تم ٹھیک ہو نمبر ۱۲۔ تمہارے سامنے اس وقت میں ہوں،  
کیا ہوا تھا؟

"میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچ گیا تھا۔ پھر  
میں نے آپ کو پیغام دیا۔ وہ ایک جگہ نظروں سے اوجھل ہو  
گیا تو میں آگے بڑھ گیا۔ اور یہی میری غلطی تھی۔ میں نے  
احتیاط نہیں کی۔ اس نے دراصل مجھے دیکھ لیا اور کہیں چھپ  
کر بیٹھ گیا، پھر اچانک میرے پیچھے آ کر ایک پتھر میرے سر

پر دے مارا۔ یہ دیکھیے۔ میرے سر پر ایک چھوٹا سا سر  
اور بن گیا ہے۔ اور اس سے خون بھی رس رہا ہے۔  
"ہاں! تمہارا خون دیکھ کر ہی تو ہم یہاں تک آئے ہیں،  
اس کا مطلب ہے۔ ہم نے اسے کھو دیا۔" اکرام نے کہا۔  
"کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ ان پٹانوں کی  
طرف کیوں آیا؟

"ہو سکتا ہے۔ نمبر ۱۲ سے پیچھا چھڑانے کے لیے آیا ہو۔ اس  
نے انہیں نگرانی کرتا دیکھ لیا ہوگا۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔  
"ہاں! یہی بات ہو سکتی ہے۔"  
"تب پھر۔ اب اس کے یہاں ہونے کا کوئی امکان  
نہیں رہا۔ ہمیں اس کی تلاش کے لیے پورے شہر میں کوشش  
کرنا ہوگی۔" اکرام بولا۔  
"وہ والپسی کے لیے چلے ہی تھے کہ فاروق ٹھٹک کر رُک  
گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔



”اُو۔ ہم واپسی کا راستا اختیار کرتے ہیں۔ جب اسے یہ  
اطمینان ہو جائے گا کہ ہم جا چکے ہیں، اس وقت ہم پھر ادھر  
آئیں گے۔“

وہ واپس چل پڑے۔ یہاں تک کہ چٹانوں سے دُور نکل  
آئے۔

”میرا خیال ہے۔ اب وہ ہماری طرف سے بے فکر ہو چکا ہو  
گا۔“

”لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے ہماری چال کو بغائب لیا  
ہو۔ اور بدستور نگرانی کر رہا ہو۔“

”ہاں! ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اس سے زیادہ اور کیا کر  
سکتے ہیں؟“

”ایک کام ضرور کر سکتے ہیں: فرزانہ مسکراتی۔“

”اور وہ کیا؟ اکرام نے فوراً کہا۔“

”ہو گی اس کی کوئی ترکیب: فاروق نے مزہ بنایا۔“

”میری ترکیب آخر تمہیں ملن میں کیوں مبتلا کر دیتی ہے۔“

فرزانہ نے جل کر کہا۔

”جل خود رہی ہے اور الزام مجھ پر۔ جی واہ۔“ فاروق

نے بھٹا کر کہا۔

”جھٹنے کا مقابلہ پھر کبھی کر لینا۔ اس وقت دشمن سے

## ایک فائر

”خیر تو ہے۔ تمہیں کیا ہوا؟“ الیکٹر حشید نے فوراً اس  
کی کیفیت بھانپ لی۔

”میں نے کسی کی ایک جھلک دیکھی ہے اس طرف۔ ایک  
سر۔ جو ایک چٹان کے پیچھے آجرا ہوا تھا۔ اس نے سرگوشی  
کی۔“

”اس کا مطلب ہے۔ وہ ہمیں کہیں چھپا ہوا ہے۔“ الیکٹر  
جشید بولے۔

”لیکن سر۔ ان حالات میں تو وہ بہت خطرناک ثابت  
ہو سکتا ہے۔“ اکرام بڑبڑایا۔

”ہاں! اکرام تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ہمیں دیکھ سکتا ہے۔“

جب کہ ہم اسے دیکھنے کے قابل نہیں۔ ایسے میں اگر وہ فائرنگ  
شروع کر دے تو ہمارا کیا بنے گا۔“

”آئلیٹ۔“ فاروق بولا۔

مقابلہ ضروری ہے۔ اس نے ہم سب کو چکر دے رکھا ہے۔  
آخر مسٹر نمبر ۱۳ کس کی نگرانی کر رہے تھے؟

”مجرم کی۔ جو اس کیس کا اصل مجرم ہے۔“ انپیکٹر جمشید بولے۔

”اور اصل مجرم کون ہے؟“  
”جس کی ہمیں تلاش ہے۔“ انھوں نے شوخ آواز میں کہا۔  
”بہت خوب۔ یہ ہے جواب۔“ فاروق نے سمسوی صورت بنائی۔  
”فرزاد تم کوئی ترکیب بتا رہی تھیں۔“  
”جی ہاں! اس نے کہا اور دہی آواز میں اپنی ترکیب بتانے لگی۔

”ترکیب واقعی زور دار ہے۔“ انپیکٹر جمشید اس کے خاموش ہونے پر بولے۔

”فرزاد کی ترکیب اور زور دار نہ ہو۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ فاروق بولا۔

”تم پر کوئی پابندی تو ہے نہیں۔“ فرزاد نے اسے گھورا۔  
”ہم اس وقت فرزاد کی ترکیب پر عمل شروع کر رہے ہیں۔“ انپیکٹر جمشید نے گویا اعلان کیا۔

اور پھر وہ ریٹکے کے انداز میں اس سمت میں چل پڑے، جس طرف فاروق کو کسی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ اپنے

سروں کو اونچا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ اس طرح ان کی رفتار بہت سست رہی؛ تاہم وہ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے اندازے کے مطابق اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں فاروق کو کسی کی جھلک دکھائی دی تھی۔

”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ محمود نے منہ بنا کر کہا۔  
”کم از کم میں ایک بات دعوے سے کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے وہم نہیں ہوا تھا۔ میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔“

”تب پھر۔ یہاں اس کو موجود ہونا چاہیے تھا۔“ محمود نے بتانا کر کہا۔

”ہمارے چلے جانے کے بعد اسے یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔“ فاروق نے جواب دیا۔

”تب پھر وہ یہاں آیا کیوں تھا۔“ محمود بولا۔  
”اس سے پوچھ کر بتاؤں گا۔“

”میرا خیال ہے۔ ہمیں کچھ اور آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیے۔“ انپیکٹر جمشید نے کہا اور آگے بڑھنے لگے۔ اچانک ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ایک شین گن کی نال ان کی نظروں کے سامنے تھی، لیکن وہ جس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ انھیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ چٹان میں ایک سوراخ تھا



اور یہ نال اس سُورخ سے جھانک رہی تھی :

"تم سب ہاتھ اُپر اٹھا دو۔ بہت چالاک بننے ہو۔  
غراہٹ زدہ آواز سنائی دی۔

"معاف کر دیں۔ اب بہت چالاک نہیں بنیں گے :  
فادوق نے کانٹ کر کہا۔

"بس۔ نکل چکی جان ابھی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ  
تم لوگ بہت دلیر ہو۔

"جی۔ بس۔ اب کیا بتائیں فادوق بولا۔  
"کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے تھلا کر کہا۔

"آپ ہیں کون اور پورے میں کیوں بیٹھے ہیں۔  
سامنے کیوں نہیں آتے۔

"سامنے بھی آؤں گا۔ گوگے۔ ان کے پستول وغیرہ  
نکال لاؤ۔ دیکھو پوری احتیاط سے۔۔۔ کوئی چال نہ چل  
جائیں۔ اس نے کہا۔

"فکر نہ کریں باس۔ ان کے تو فرشتے بھی چال نہیں  
چل سکیں گے۔

"بھئی ہمارے فرشتوں کی شان میں کوئی گستاخی نہ کرنا  
ورنہ ہم بہت بُری طرح پیش آئیں گے۔

"سنا باس۔ یہ کیا کر رہا ہے۔ گوگے بولا۔

"ہاں اسن چکا ہوں۔ تم اپنا کام کرو۔

انہوں نے گوگے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اسی  
جٹان کے پیچھے سے نکلا تھا جس میں سے رائفل کی نال  
جھانک رہی تھی۔

"اگر کسی نے بھی حرکت کی کوشش کی تو سینہ چلنی ہو  
جائے گا۔ یہ خیال رہے۔

"اچھا۔ خیال رہے گا۔ فادوق نے بل بھن کر کہا۔  
گوگے نے پورے اطمینان کے ساتھ ان کے پستول نکال

لیے، پھر بولا :  
"میں فادوق ہو چکا ہوں باس۔

"ہاں! میں دیکھ سکتا ہوں۔ اب ان لوگوں کے پیچھے  
دونوں ہاتھوں میں پستول لیے کھڑے رہو۔ اگر ان میں سے

کوئی ذرا بھی حرکت کرے تو میری طرف سے اجازت ہے،  
میں پر فائر کر سکتے ہو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔

"شکریہ باس۔ کم از کم میں اس پر فائر کرنے کے لیے بے چین  
ہوں۔ اس نے فادوق کی طرف اشارہ کیا، پھر چونک اٹھا :

"ارے! اس کے منہ سے نکلا۔  
"کیا ہوا۔" شین گن والا جلدی سے بولا۔

"ان۔ ان کے ساتھ وہ بھی تو تھی۔ وہی لڑکی۔ جو

ہوٹل میں اس کے ساتھ تھی۔

”اوہ ہاں! واقعی۔ کیوں بھی۔ تمہاری بہن کہاں ہے؟“  
”نکل گئی ہوگی، ادھر ادھر گھومنے۔ اسے دراصل گھونٹے  
پھرنے کا بہت شوق ہے۔“ فاروق نے کہا۔

”اب کیا کیا جائے باس؟“

”سو کھا آرہا ہے۔ وہ اس کی تلاش میں نکلے گا۔ تم  
ان لوگوں کو غار میں لے آؤ۔“ اس نے کہا۔

”چلو بھی قدم اٹھاؤ۔“ درد نے دھمکی دی۔

وہ چلنے لگے۔ اسی وقت دوسری طرف سے موکھا آ  
نظر آیا۔ اس نے ان پر ایک نفرت آمیز نظر ڈالی اور  
پھر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا:

”میں اس آفت کی پرکالا کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں، پھر ایک  
ساتھ ان سے بیٹھیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ اچھا پروگرام ہے۔ اگر باس نے اجازت دی ہو تو  
”میں تمہیں دلوں کی بھڑاس نکالنے کا پورا پورا موقع دوں  
گا۔“ باس بولا۔

”شکریہ باس۔“ سوکھے نے خوش ہو کر کہا۔

پھر ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ آخر وہ ایک  
غار میں داخل ہوئے۔ غار کے اندر کا منظر حد درجہ عجیب

تھا۔ غار کی چھت میں لوہے کے ہک لگے ہوئے تھے۔

ان ہکوں سے رسیاں ٹٹک رہی تھیں۔ ان میں سے ایک  
رسی کے ساتھ ملک اختر خالد اُلٹا ٹٹکا ہوا تھا۔ جواری ماما  
کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ چار آدمی اور غار کے دائیں بائیں  
موجود تھے، ان کے ہاتھوں میں بھی سٹین گنیں تھیں۔

”کسی انسان کا جسم چھلنی بننے دیکھا ہے کبھی انیکٹر جمشید؟“  
جواری ماما نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں! اکثر دیکھا ہے۔“

”لیکن جس انداز سے ہم ملک اختر خالد کو چھلنی کریں  
گے۔ اس انداز سے کبھی کسی نے کسی کو چھلنی نہیں کیا ہو  
گا۔“

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“ ملک اختر چلایا۔

”یہ سب کیا چکر ہے۔ تم اسے کیوں مار ڈالنا چاہتے  
ہو؟“

”اس لیے کہ یہ میری بات کا جواب نہیں دے رہا۔“

”اوہ۔ بُری بات ہے۔ سوال کا جواب تو اسے دینا چاہیے۔“

”دینا چاہیے نا۔ یہی میں اب تک اس سے کہہ رہا ہوں،  
تم نے سنا مسٹر اختر۔ انیکٹر جمشید نے کیا کہا ہے۔“

”انہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ سوال کا جواب دینے کے



بعد میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ ملک اختر نے تھلا کر کہا۔

”کیا مطلب۔ کیا سلوک ہوگا؟“

”یہ مجھے فوری طور پر سمجھوں ڈالیں گے۔“

”اور نہ بتانے کی صورت میں آپ انیکٹر جمشید بولے۔“

”اس صورت میں یہ مجھے جان سے نہیں ماریں گے۔“

”کیوں کہ جب تک میں زندہ ہوں۔ سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ مرنے جانے کی صورت میں تو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔“

”اوہ۔ اچھا بہت خوب۔“

”تو نہ بتانا ہی بہتر ہے۔“

”اختر خالد؟“ انیکٹر جمشید بولے۔

”لیکن آخر کب تک۔“

”ملک دہنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔“

”اس حد کے گزرنے کی دیر ہے۔“

”بھریہ پیچھے چھوڑ کر بتائے گا۔“

”آخر وہ سوال کیا ہے؟“ انیکٹر جمشید بولے۔

”یہ میں بتا دیتا ہوں۔ چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

ڈاکٹر ارما نے ایک خاص قسم کے جراثیم دریافت کیے تھے۔ اس نے جان داروں پر ان جراثیم کا تجربہ کر کے دیکھا اور بہت حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔ اتنے

شاید خود ڈاکٹر کو بھی امید نہیں تھی۔ لیکن اس سے بات

پیٹ میں نہ رہ سکی۔ اپنے ماتحت قاسم عرف راون کو مامور

بات بتا دی۔ ڈاکٹر برا آدمی نہیں تھا۔ وہ ان جراثیم سے

ملک اور قوم کے لیے کام لینا چاہتا تھا اور اس سلسلے

میں اس نے پروفیسر داؤد سے بھی ملاقات کی تھی، لیکن

ادھر قاسم کا دماغ اُلٹ گیا۔ اس نے اپنے بھائی ملک

اختر خالد سے بات کی۔ اس کے ذہن میں ایک اور ہی

منصوبے نے جنم لے ڈالا۔ یہ میرا واقف تھا۔ میری مدد

سے اس نے اپنے دو دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتروایا

تھا۔ چنانچہ یہ مجھ سے ملا اور جراثیم کی کہانی سنائی۔ یہ

جراثیم میرے لیے مدد دے گا کام کی چیز تھے۔ نہ صرف میرے

لیے۔ بلکہ مجھ جیسے اور لوگوں کے لیے بھی۔“

”کیا مطلب؟“ فاروق نے کچھ سوچ کر جلدی سے کہا۔

”میرا مطلب ہے۔ کرائے کے قاتلوں کے لیے یہ جراثیم

بہت ہی محفوظ ذریعہ تھے۔ یعنی ایک آدمی کو جراثیم کے

ذریعے ہلاک کر دو، لیکن پولیس کبھی بھی اس واردات

کو قتل کی واردات نہیں کہے گی۔ ڈاکٹری رپورٹ بھی

یہی ہوگی کہ مارٹ فیل سے موت ہوئی ہے۔ یعنی کبھی

کو کالوں سے پتا نہ چلے گا کہ فلاں آدمی کو قتل کیا گیا

ہے۔ ماہرین اور باقی سب لوگ یہی خیال کریں گے کہ

دل کے فیل ہونے کی وجہ سے مرا ہے۔ اور اس لیے

یہ جراثیم میرے لیے بہت اہم ہیں۔ بہت خاص ہیں۔ محفوظ طریقے سے دولت کے ڈھیر جمع کرنے کا آسان ترین نسخہ ہے۔ اپنے غنڈوں کو بھیج کر دوسروں کو ختم کرانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس طریقے میں دھڑکا بہر حال لگا رہتا تھا کہ کبھی کبھی کوئی غلطی تو ہو ہی جاتے گی۔ اور بالوں میں میرے خلاف ثبوت حاصل کر ہی لے گی۔ لہذا میں یہ جراثیم خریدنے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن میں نے ایک شرط لگائی۔ اور وہ یہ کہ پہلے یہ کسی آدمی کو جراثیم کے ذریعے ہلاک کر کے دکھائیں۔ جب ڈاکٹری رپورٹ ہارٹ فیل کی مل جاتے گی، اسی وقت میں ان جراثیم کو خریدوں گا۔ ان کو کہنا تھا کہ ایسی دس گیندیں ان کے پاس ہیں۔ اور ان میں جراثیم ختم نہیں ہوتے۔ بلکہ اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ملک اختر نے یہ پیش کش منظور کر لی۔ اس کا فلک انصاری سے زمینوں کا کچھ چکر تھا۔ اس نے سوچا۔ فلک انصاری کو جراثیم کا نشانہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی قاسم کو فلک انصاری کے گھر بھیج دیا۔ یہ وہاں گیا۔ غربت بہانا بنا کر ملازمت حاصل کی۔ اس کے بعد وہاں نہ جانے کیا ہوا۔ یہ لوگ پروگرام کے مطابق فلک انصاری

کو تو جراثیم کا شکار نہ بنا سکے، وہاں قاسم خود بن گیا۔ اس کی وضاحت میں کر دیتا ہوں۔ جراثیم کی گیند دراصل فلک انصاری کے بیٹے ریحان انصاری کو اپنے گھر میں پڑی ملی، یہ قاسم کے پاس سے کہیں گر گئی ہو گی، یا اس نے جان بوجھ کر گھر کے کسی کونے میں رکھ دی ہو گی، تاکہ موقع ملے ہی گیند وہاں سے اٹھا کر اپنا کام دکھا دے۔ ریحان انصاری اسے سکول لے گیا۔ اور پھر اس سے اتفاق سے گیند کلاس روم میں گر گئی۔ جو فاروق کے ہاتھ لگی۔ فاروق کے ہاتھ میں پروفیسر داد نے دیکھی۔ اور وہ چونک اٹھے، کیوں کہ یہ گیند وہ ڈاکٹر ارماتھ کے ہاتھ میں دیکھ چکے تھے۔ اس طرح یہ چکر شروع ہوا۔ ہم گیند کے ذریعے فلک انصاری سے ملے۔ وہاں قاسم سے ملاقات ہوئی۔ مجھے قاسم پر شک ہو گیا۔ ادھر باہر ملک اختر۔ یعنی قاسم کا بھائی حالات سے باخبر رہنے کے لیے موجود تھا۔ اس نے اندر گڑ بڑ محسوس کر لی۔ اس وقت وہ میک آپ میں تھا؛ چنانچہ اندر آ گیا۔ اور اپنے بھائی کو ان جراثیم کا نشانہ بنا کر چلتا بنا۔

لیکن کیسے آبا جان؟

جراثیم جسم میں داخل کرنے کا طریقہ بہت حیرت انگیز



ہے۔ اور یہی بات شاید جواری ماٹا ملک اختر سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کیوں بھئی۔ ٹھیک ہے نا۔  
 "ہاں! بالکل ٹھیک۔" جواری ماٹا بولا۔

"بہر حال۔ بہت آسان طریقہ ہے، لیکن اس ساری کہانی میں جو سب سے اہم چیز ہے۔ وہ ہے لاپچ۔ قاسم نے لاپچ کیا۔ ڈاکٹر ارماط سے ان جراثیم کو بنانے اور انہیں جسم میں داخل کرنے کا طریقہ معلوم کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ اور ڈاکٹر ارماط کے دوسرے اسٹنٹ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"اور ہم یہ خیال کرتے رہے کہ ڈاکٹر ارماط اور قاسم دونوں نے مل کر ماتحت کو قتل کیا اور غائب ہو گئے۔"  
 "ہاں! ہم نے ہی نہیں، پولیس نے بھی یہی خیال کیا تھا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔" انپیکٹر جمشید مسکراتے ہوئے

"تب پھر اصل بات کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"  
 "قاسم نے ڈاکٹر ارماط کے دوسرے اسٹنٹ کو قتل کر دیا۔ لاش کو تجربہ گاہ میں چھوڑا۔ اور ڈاکٹر ارماط کو بلیک میل

کر کے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا۔ دراصل قاسم نے راون ڈاکٹر ارماط سے ان جراثیم کے بارے میں معلومات حاصل کر کے دولت مند بننا چاہتا تھا۔ تفصیلی بات ہمیں

ڈاکٹر ارماط ہی بتا سکتے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ان کے پاس چلیں گے۔"

"تو آپ کو معلوم ہے۔ وہ کہاں ہیں۔" محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

"اندازہ ضرور ہے۔ لیکن یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" انہوں نے کہا، پھر بولے:

"مطلب یہ ہوا کہ لاپچ نے قاسم کو اندھا کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر ارماط کے دوسرے اسٹنٹ کو قتل کر دیا اور خود ڈاکٹر ارماط کو لے کر روپوش ہو گیا۔ تین سال تک تو قاسم خاموش رہا، پھر ان جراثیم کا سودا اپنے بھائی ملک اختر کے ذریعے جواری ماٹا سے کرنا چاہا، کیوں کہ جواری ماٹا جیسے لوگوں کے لیے یہ جراثیم ایک بہت بڑی دولت ہیں۔ ادھر جواری ماٹا نے ان جراثیم کو مفت میں حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا اور ملک اختر کو یہاں بلا کر جکڑ لیا۔ لاپچ کا انجام یہی ہوتا ہے۔ اب رہ گیا جواری ماٹا۔" انپیکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

"رہ میں نہیں۔ تم گئے ہو۔ شاید تم بھول گئے۔ اس وقت تم سب میرے قبضے میں ہو اور میرے یہ ساتھی تم لوگوں کو بھون ڈالنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ بس میں

یہ چاہتا ہوں۔ ملک اختر ان جراثیم کو انسانی جسم میں داخل کرنے کا طریقہ بتا دے۔ کیوں کہ ان گیندوں پر میں چاقو، چھریاں، پنیں۔ سب کچھ آزما چکا ہوں۔ لیکن۔ ان میں سوراخ نہیں ہوتا۔ نہ یہ کٹتی ہیں۔ جب کہ ملک اختر نے تمام کے جسم میں یہ جراثیم آن کی آن میں داخل کر دیے تھے۔ وہ کہتا چلا گیا۔

”واقعی طریقہ بہت آسان ہے۔“ انیکٹر جمشید مسکراتے۔

”یہ اور اچھا ہے۔ پہلے طریقہ جاننے والا صرف ایک تھا، اب ایک سے زیادہ ہیں۔“ جواری ماٹا نے خوش ہو کر کہا۔  
عین اسی وقت ایک فائر ہوا اور ملک اختر خالد کی سی کٹ گئی۔

## افسوس!

فائر کی آواز نے ان سب کو اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس موقع بھی اگر انیکٹر جمشید، محمود، فادوق اور اکرام فائدہ نہ اٹھاتے تو پھر ہاتھ ہی ملنا پڑتے؛ چناں چہ انہوں نے ایک ساتھ چھلانگیں لگائیں۔ اور رائفل برداروں پر جا پڑے۔ پہلے ہی ہتے میں وہ رائفلیں پھینکنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر ایک فائر اور ہو چکا تھا۔ اور اس فائر نے جواری ماٹا کے ہاتھ والی ٹین گن فضا میں اچھال دی تھی۔ جلد ہی فرزانہ اندر داخل ہو رہی تھی، اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

”سو گئے کا کیا بنا فرزانہ؟“ انیکٹر جمشید مسکراتے۔

”سو گئے کیا بے چارہ۔ بس ایک پتھر کی مار ثابت ہوا۔“ اس نے کہا۔

”ہوں! مجھے امید تھی۔ تم ایسا ہی کرو گی۔“ انیکٹر جمشید



بولے۔

"اب میدان ہمارے ہاتھ ہے۔ ان سب کو باندھ لیتا ہے۔ کیوں کہ ابھی ہمیں ڈاکٹر ارمط سے بھی ملاقات کرنی ہے۔"

"اوہ ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے ذرا مسٹر جولیا ماما سے تو دو باتیں کر لیں۔" محمود بولا۔

"ضرور کیوں نہیں۔ اجازت ہے۔"

"جواری ماما۔ اب تم کیا کہتے ہو۔ اب بھی تمہارے خیالات ہمارے پاس کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟"

"بالکل نہیں۔ یہاں ہونے والی گفت گو کو عدالت میں ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے غرر کر کہا۔"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ ہم اس گفت گو کو ثابت کر سکتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"کس طرح؟ وہ پریشان ہو گیا۔"

"ادھر دیکھو۔ میری گھڑی میں ایک مائیکرو ٹیپ ریکارڈ موجود ہے۔ تمام گفت گو ٹیپ ہو چکی ہے۔"

"نہیں! جواری ماما پوری قوت سے چلائی۔"

"اس نہیں کا مطلب شاید ہاں ہے۔ کیوں فرارازہ فاروق مسکرایا۔"

"ہاں بالکل۔"

پھر انھوں نے ان سب کو جکڑ لیا۔ اگر کام نے وائرلیس کے ذریعے اپنے ماتحتوں کو وہاں طلب کیا اور ان سب کو ان کے حوالے کر دیا۔ اس دوران انسپکٹر جمشید نے ملک اختر خالد سے علیحدگی میں کچھ گفت گو کی۔

"اب کہاں چلنا ہے ابا جان؟ ان کے جاتے ہی محمود بولا۔"

"ڈاکٹر ارمط کے ہاں۔"

"اور وہ ہمیں کہاں ملیں گے؟"

"بھئی۔ سیدھی سی بات ہے۔ وہ مسکرائے۔"

"سیدھی سی بات۔ نظر تو نہیں آتی۔" فاروق حیران ہو کر رہ گیا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

آخر ان کی جیب ڈاکٹر ارمط کی تجربہ گاہ کے سامنے آئی۔

"یہاں تو ہم پہلے بھی آپکے ہیں۔ اگر ڈاکٹر ارمط یہاں ہوتے تو اس وقت ہی ذ نظر آ جاتے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"قاسم اور ملک اختر خالد نے مل کر یہ پروگرام بنایا تھا۔ انھوں نے دوسرے نائب کو قتل کر دیا۔ اور لاش کے

اوپر ڈاکٹر ارمات کو گرا دیا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ میں  
 دے دیا۔ اسے نیم بے ہوشی کی کوئی دوا دے دی  
 گئی تھی۔ اس حالت میں اس کی تصاویر اُتار لی گئیں،  
 ہوش میں آنے پر اسے بتایا گیا کہ اس نے اپنے نائب  
 کو قتل کر دیا ہے۔ ثبوت کے طور پر تصاویر موجود ہیں،  
 تصاویر دیکھ کر ڈاکٹر ارمات گھبرا گئے۔ اب وہ پوری طرح  
 ان دونوں کے قبضے میں تھے۔  
 لیکن کیوں اب جان۔ وہ اس نائب کے ساتھ ہی ڈاکٹر  
 ارمات کو بھی ختم کر سکتے تھے۔

”یہی ڈاکٹر ارمات نے عقل مندی کی تھی اس نے جراثیم کے  
 راز کسی کو نہیں بتایا تھا۔ جراثیم بناتے کس طرح  
 سکتے ہیں۔ انھیں ان گیندوں میں بند کس طرح کیا  
 سکتا ہے۔ صرف ان جراثیموں کو دوسروں کے جسم میں  
 کرنے کا طریقہ اس نے انھیں بتا دیا ہو گا۔ وہ بھی یہی  
 دھمکی کی بنا پر۔ کیوں کہ اگر قاسم اور ملک اختر کو  
 سے کچھ بھی معلوم نہ ہو پاتا تو پھر وہ اسے ثبوت  
 پولیس کے ہی حوالے کرتے۔ لیکن جب تک اس  
 کسی فائدے کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ اس وقت تک  
 پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے تھے اور نہ ختم کر سکتے تھے۔“

یہ بات ڈاکٹر ارمات نے بھی بھانپ لی تھی۔ اگرچہ ملک اختر  
 نے یہ بات نہیں بتائی کہ ڈاکٹر ارمات اب کہاں ہے،  
 لیکن میں یقین سے اب یہ بات کر سکتا ہوں کہ وہ  
 یہیں کہیں ہیں۔ وہ لمبا آدمی جواری ماٹا کے علاوہ دراصل  
 ملک اختر خالد کا آدمی تھا۔ جواری ماٹا کو تو ہم سے  
 کوئی خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود کو بالکل محفوظ خیال  
 کر رہا تھا۔ ہم سے خطرہ محسوس ہوا تھا ملک اختر کو۔  
 اس لیے اس نے قاسم کو ختم کر دیا اور پھر تم لوگوں کو  
 بھی ختم کرانے کی کوشش کی۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو  
 منظور ہوتا ہے۔ انپیکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

آخر وہ تجربہ گاہ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اب  
 پھر پولی تجربہ گاہ کا جائزہ لیا۔ لیکن ڈاکٹر ارمات کا کہیں  
 نام و نشان نہیں تھا۔

”اب ہم کس طرح تلاش کریں۔“ فاروق بڑبڑایا۔  
 ”اس کام کے لیے ضرور کوئی خفیہ جگہ استعمال کی گئی ہے،  
 شہر۔ میں کوشش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر انھوں نے منہ سے  
 بلند آواز نکالی:

”ڈاکٹر ارمات۔ میں انپیکٹر جمشید آپ سے مخاطب ہوں،  
 قاسم مارا جا چکا ہے۔ اس کے بھائی ملک اختر خالد کو گرفتار



نے انہیں یہاں چھپنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انہوں نے اس قسم کا کوئی انتظام ضرور کر رکھا ہوگا کہ اوپر ہونے والی گفت گوئیں سکیں۔

”ہوں! ٹھیک ہے۔ تو پھر چلیے۔“

وہ تاجر بگاہ سے نکل کر جیپ کی طرف بڑھے :

”ابھی ابھی مجھے ایک خیال آیا ہے۔“ اچانک فرزانہ

بڑ بڑائی۔

”چلو اگر خیال آہی گیا ہے تو بتا بھی دو۔“ فاروق

نے کہا۔

”اور وہ خیال ہے۔ لمبے آدمی کے بارے میں۔“

”لمبے آدمی کے بارے میں۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ کہیں وہ لمبا آدمی اس وقت ڈاکٹر ارماط

کے پاس نہ ہو۔ صاف ظاہر ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بولنے کی

مہلت کب دے گا۔“

”ہوں۔ خیال واقعی زور دار ہے۔ خیر اب ہم بھی چال

چلیں گے۔“ انیکٹر جمشید نے کہا۔

وہ جیپ میں بیٹھ کر وٹاں سے روانہ ہوئے، پھر جیپ

کو ایک جھنڈ میں کھڑا کر کے واپس چلے، لیکن غیر محسوس طور

پر اور درختوں کی اوٹ لے لے کر۔ اب وہ عمارت کے

کے قریب پہنچے۔ ان دونوں نے آپ کے خلاف دراصل

کے منہ کی تھی۔ پکڑ چلایا تھا۔ آپ کے اسٹنٹ

کے منہ نے خود ہی قتل کیا تھا۔ اب آپ پوری طرح

آزاد ہیں، آپ پر قتل کا کوئی الزام نہیں۔ آپ جہاں

کہیں بھی ہیں۔ وہاں سے نکل کر باہر کی دنیا میں سانس

لے سکتے ہیں۔ یہ کوئی فریب نہیں ہے۔ دھوکا نہیں ہے،

آپ ہم پر یقین کریں۔ اتنا کہ اگر انیکٹر جمشید خاموش ہو

گئے۔ اور انتظار کرنے لگے۔

تین منٹ کی خاموشی کے بعد انہوں نے پھر یہی الفاظ

دہرائے۔ لیکن ڈاکٹر ارماط کی طرف سے کوئی جواب نہ

ملا۔ آخر انیکٹر جمشید نے کہا :

”اگر آپ کو ہماری بات پر یقین نہیں آیا تو پھر ہم

جا رہے ہیں۔ آپ ہمارے جانے کے بعد نکل آئیے

گا اور کہیں بھی چلے جائیے گا۔ آپ پر کوئی الزام نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ان کی طرف مڑے :

”چلو جی چلیں۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے ابابا جان کہ وہ ہماری آواز سن ہی

د رہے ہوں۔ کسی تہ خانے وغیرہ میں ہوں۔“

”بھئی وہ ایک سائنس دان ہیں۔ قتل کی سزا کے خوف

باروں ٹپکھڑے ہو گئے اور نظریں اس پر جما دیں۔  
انہیں پندرہ منٹ کا تکلیف دہ انتظار کرنا پڑا، پھر دروازہ  
کھلا اور لبا آدمی باہر نکلتا نظر آیا۔ اس نے احتیاط سے  
ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس کے  
تغاقب میں ہو لیے۔ اس کے قریب پہنچ کر انپکٹر جمشید نے  
سرد آواز میں کہا:

”جبردار! اٹھ اور اٹھا دو۔“

وہ زور سے اچھلا۔ اور پھر بھڑک کر بھاگا، لیکن محمود  
نے فوراً ٹانگ آگے کر دی۔ نتیجہ یہ کہ منہ کے بل گرا۔  
”دیکھ کر دوڑو جی۔ کیا کرتے ہو؟“ فادون گھبرا کر بولا۔  
اسی وقت انپکٹر جمشید نے اسے گدی سے بٹھرایا۔

”چلو اندر۔ اور بتاؤ۔ ڈاکٹر ارماط کہاں ہیں؟“

”وہ یہاں کہاں؟ اس نے چننی چننی آواز میں کہا۔

”اگر وہ یہاں نہیں ہیں، پھر تم یہاں کیا کر رہے  
ہو؟“ انپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ  
اسے عمارت کے اندر لے آئے۔ اب جراحوں نے اس

کی گدی پر دباؤ ڈالا تو چلا اٹھا:

”بب۔ بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ مسکرائے۔

وہ کبھی مشین کی طرح ایک کمرے کی الماری کی طرف  
بڑھا۔ الماری کے پٹ کھول ڈالے۔ اس کی سامنے والی  
دیوار بھی کھڑکی کی تھی۔ اس پر ایک خاص جگہ سے دباؤ  
ڈالا تو وہ کسی دروازے کی طرح ہٹ گئی۔ اور انہیں  
سیرٹھیاں نظر آنے لگیں۔ وہ سیرٹھیاں اُترتے چلے گئے۔

نیچے زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ اور کمرے کے فرش

پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس قدر

پیدا ہو چکا تھا کہ کیا کسی مُردے کا ہو گا۔ اس کی آنکھیں

کھلی تھیں۔ لیکن ان میں اس قدر مُردنی تھی کہ اس شخص

کو زندہ خیال کرنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

آپ۔ آپ ڈاکٹر ارماط ہیں۔“

”کب۔ کبھی۔ تھا۔“ اس نے حسرت زدہ انداز میں کہا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے کوئی قتل و قتل نہیں

کیا۔ یہ ان لوگوں کی سازش تھی؟“

”یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ ڈاکٹر ارماط نے مشکل

سے کہا۔

”ابھی میں اوپر سے آپ کو آوازیں دے رہا تھا۔

کیا آپ نے میری آوازیں نہیں سنی تھیں؟“



نہیں۔ میرے حواس جواب دے چکے ہیں۔ نزدیک کی آواز تو سن سکتا ہوں، دُور کی نہیں۔

"خیر۔ اس لمبے آدمی نے ضرور میری آواز سنی تھی۔ اور اب یہ شہر جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ آپ اس کو جانتے ہیں؟"

"یہ انہی کا ایک ساتھی ہے۔" ڈاکٹر بولا۔

"آپ نے ان جراثیم کے بارے میں ان لوگوں کو کہاں تک بتایا ہے؟"

"صرف ان کو استعمال کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ وہ بھی ان کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر۔ دُور میں تو وہ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ گیند کو ایک خاص انداز سے پکڑ کر کسی انسان کی جلد پر رکھ کر دبا دو۔ جراثیم ایک ننھی سی دھار بن کر جسم میں داخل ہو جائیں گے اور دیکھنے پر ایسے معلوم ہو گا کہ جیسے کوئی سوئی چھوئی گئی ہے۔"

"بالکل یہی طریقہ پروفیسر داؤد نے گیند کا تجربہ کر کے مجھے بتایا ہے۔ کاش! آپ موت سے نہ ڈرتے۔ ان کو کچھ نہ بتاتے۔ کیوں کہ انہوں نے ایک شخص کو تجربے کے طور پر ہلاک کرنا چاہا تھا۔ یہ اور بات ہے مرا خود ان

کا آدمی یعنی آپ کا اسٹنٹ قاسم عرف راون۔ یہ اسے ہلاک کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔"

"اوہ۔ اوہ۔"

"ان لوگوں کو جراثیم کی بھنک پڑ کیسے گئی تھی؟"

"میں نے تو ہر بات چھپا رکھی تھی، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ راون ہر وقت میری نگرانی کرتا رہتا ہے۔ اس نے حسرت زدہ آواز میں کہا۔

"ہم آپ کو باہر کی دُنیا میں لے چلیں گے۔ امید ہے آپ خوشی محسوس کر رہے ہوں گے۔"

"نہج۔ خوشی۔ پتا نہیں۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ اس طویل سفر پر احساس مجھ سے چھین لیا ہے۔" ڈاکٹر اڑا دیا۔

"نکر نہ کریں۔ رفتہ رفتہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آئیے میں سہارا دے کر آپ کو لے چلوں۔"

"انیکٹر جمشید اسے سہارا دینے کے لیے جُھکے۔ اسی وقت ڈاکٹر کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے مشکل سے کہا:

"شاید۔ اب وقت گزر گیا ہے۔"

"وقت گزر گیا ہے۔ کس چیز کا؟ محمود کے منہ سے نکلا۔

"میرے باہر جانے کا۔ اب۔ اب تو میں۔"

"وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کی گردن دھلک

گئی۔ انیکٹر جمشید کے ہاتھ پھیلے رہ گئے۔

”افسوس! ان کے منہ سے نکلا۔

”یہ انجام کس قدر حسرت ناک ہے۔“ فرزانہ نے بھڑائی ہوئی

آواز میں کہا۔

”اور یہ سب کچھ انسان کے لاپچ کی وجہ سے ہوا۔

کاش ہم لوگ جان لیں۔ ہمارے دین میں لاپچ کو کس قدر

برا کہا گیا ہے۔ کتنی سختی سے لاپچ سے روکا گیا ہے۔ اصل

وجہ یہی ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم سے دور ہو گئے ہیں۔“

انیکٹر جمشید نے درد بھرے انداز میں کہا۔

لبا آدمی بھی اب پٹنی پٹنی آنکھوں سے ڈاکٹر کے مُردہ

جسم کو دیکھ رہا تھا۔



یہ کتاب اچھی حالت میں ہے کتاب کے  
پہننے یا خراب ہونے کی صورت میں  
میکورٹی میں سے جرمائد کات لیا جائے گا

# گیند کا طوفان

## پر انعام حاصل کیجیے۔

○ ناول ”گیند کا طوفان“ آپ نے پڑھا اب فوراً اس پر اپنی رائے لکھیے۔

○ سب سے پہلے موصول ہونے والے دو خطوط پر ۵۰، ۵۰ روپے

کا نقد انعام روانہ کیا جائے گا۔

○ ان کے بعد پہلے موصول ہونے والے آٹھ خطوط پر ۵، ۵

کتابوں کے پکیٹ بطور انعام روانہ کیے جائیں گے، کتابیں

ادارہ اپنی پسند کی روانہ کرے گا۔

○ یہ دس خط آئندہ ماہ کے ناول کے آخر میں اسی ترتیب سے

شائع ہوں گے جس ترتیب سے موصول ہوں گے۔

○ یہ ضروری نہیں کہ خط ناول کی تعریف میں ہو۔ ناپسندیدگی

کا بھی ہو سکتا ہے۔

○ یہ خطوط ارسال کرنے کے لیے پتافوٹ کر لیں:

اشتیاق احمد، وی ۶/۸، سٹیل لائٹ ٹاؤن، جھنگ صدر

○ لفافے کے اوپر برکیٹ میں انعامی سلسلہ ضرور لکھیں۔ (انعامی سلسلہ)



## آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انپکٹر جمشید سیریز ۱۹۲

## آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انپکٹر جمشید سیریز ۱۹۳

## انسانی کنواں

— مصنف: اشتیاق احمد —

- پانچ جانیوں پر ایک شخص کے قتل کا الزام تھا۔
- وہ اس الزام کو درست مانتے تھے، قتل کا اقرار کرتے تھے، لیکن —
- لیکن قتل کی وجہ کسی کو بتانے پر تیار نہیں تھے۔
- عدالت سے انھیں عمر قید کی سزا ہو گئی۔ لیکن وجہ اب بھی کسی کو نہیں معلوم تھی۔
- محمود، فاروق اور فرزانہ وجہ کی تلاش میں نکلتے ہیں۔
- خان رحمان ان کے ساتھ تھے۔
- انپکٹر جمشید کس موقع پر کیس میں شریک ہوئے۔
- قیمت: ۶/۵۰ روپے

— مصنف: اشتیاق احمد —

- آپ کے کرداروں کو اس مرتبہ ایک ہنگامہ پروو کیس مل گیا ہے۔
- مجرموں کا منصوبہ انتہائی ہولناک تھا۔
- ہر لمحے آپ کا دل دھڑکے گا۔
- آخر میں مجرم کی چالیں آپ کو چکرا دیں گی۔
- لیکن اس کا مقابلہ بھی انپکٹر جمشید سے تھا۔
- بیگم جمشید نے حالات کا مقابلہ کس طرح کیا۔ آپ بے ساختہ مسکرا دیں گے۔
- محمود، فاروق اور فرزانہ کو جب موت کا سامنا کرنا پڑا۔
- خان رحمان اور پروفیسر داؤد سے بھی ملیے۔
- قیمت: ۶/۵۰ روپے